THE CHRISTIAN VIEW OF GOD
AND THE WORLD (Part II)

By Revd. Prof. James Orr D. D.

Reprint from Masihi Tajalli, 1912—13.

حل مشکلات

یعنی

خدا اور دُنیا کی نسبت مسیحی مذہب کی رائے

حِصّہ دوم

جو

سکاٹلینڈ کے عالم متبحر اور مشہور تھیولوجین پروفیسر جیمس - آر - ڈی - ڈی - کی نادر کتاب
"دی کرسچن ویو آف گاڈ اینڈ دی ورلڈ" سے اہل تحقیق کے لئے تیار کی گئی ہے

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی

انارکلی لاہور

بار اول ۱۰۰۰ سنہ ۱۹ ۶ ۱۱ قیمت ۸ر فی جلد

P. R. B. S. LAHORE

غلام قادر مسیحی پرنٹر لاہور کی معرفت
نولکشور لمیٹڈ پریس لاہور میں چھپی

-6230-

خدا اور دنیا کی نسبت مسیحی مذہب کی رائے

حصۂ دوم

باب چھٹا

مسیحی مذہب کا سب سے بڑا دعویٰ
یعنی خدا کا مسیح میں مجسّم ہونا

ہم اس کتاب کے دوسرے باب میں دکھا آئے ہیں کہ مسیح کی ذات اور شخصیت کی نسبت دو باتوں میں سے صرف ایک ہی بات مانی جاسکتی ہے یعنی یا تو ہم اُسے ایک الٰہی شخص مانیں۔ اور یا اُسے محض انسان تصور کریں۔ اس دلیل کو ہم یہاں مفصل اور مکمل صورت میں پیش کرینگے اور دکھائیں گے کہ وہ حقیقتیں جو مسیحی مکاشفہ میں موجود ہیں وہ ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ ہم اِن دو باتوں میں سے ایک ہی کو قبول کریں اور کوئی تیسری رائے ان کے بین بین قائم نہ کریں +

دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہیں کہ ہم اس وقت یہ دریافت کرینگے کہ اس کا کیا سبب ہے کہ ہم مسیح کو ایک اعلےٰ درجہ کا نبی نہیں مان سکتے ؟ کیا وجہ ہے کہ ہم اُس کو محض ایک ایسا شخص تصور نہیں کر سکتے جس میں کہ خدا ایسے طور پر بستا تھا جیسا کہ کہیں اور میں نہیں بستا تھا ؟ یا کیوں ہم اُسے طبقۂ انسانی [illegible]ث سے بڑا انسان نہ گردانیں یعنی ایسا انسان کہ جو کامل انسان تھا اور جو [illegible]ک کے سچے اصول کا مظہر تھا ؟ یہ خیالات تو بڑے دلپسند ہیں اور بہت

لوگ ان کو مانتے بھی ہیں۔ اور اُن کے ماننے میں کوئی بڑی مشکل بھی محسوس نہیں ہوتی۔ پھر کیوں کلیسیا ان کو نہیں مانتی؟ کیا وجہ ہے کہ وہ یہی مانتی جاتی ہے کہ وہ ایک الٰہی شخص ہے جسمیں کامل الوہیت اور کامل انسانیت پائی جاتی ہے؟ کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جب ہم مسیحی مذہب کی تمام حقیقتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کلیسیا کسی ادنےٰ قسم کی رائے کو قبول نہیں کر سکتی؟ پس ہم دعوے کرتے ہیں کہ اصل سبب یہی ہے۔ اور اس باب میں حقائق عیسوی کے امتحان سے دکھائیں گے کہ ہمارا دعوےٰ برحق ہے +

ہمارے خیال میں بہت سے لوگوں کا اعتراض تجسم کے متعلق مسیح کی پستی پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ خدا تعالےٰ یسوع ناصری میں ایک بڑھئی کے فرزند میں مجسم ہو؟ کہ ایک ناچیز سے شخص میں خدا کی معموری جسم کی صورت اختیار کرے؟ وہ ہماری قوت متخیلہ سے گویا یہ اپیل کرتے ہیں کہ کیا ایسی بات کبھی ہوسکتی ہے کہ خدائے ذوالجلال وایزد متعال جو تمام عالموں کا خالق اور صانع گوناگون کا صانع بے چون وچرا ہے وہ اس طرح ایک ناچیز سے شخص میں مجسم ہو؟ اس اپیل پر بخوبی رائے زنی کرنے اور جو اعتراض اس میں مخفی ہے اُس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری امر ہے کہ ہم چند باتوں پر شروع میں غور کریں +

یہاں ہم یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ عالمان علم الٰہی جو مسیح کے تجسم پر اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں وہ اس بات پر غور کریں کہ اگر وہ مسیح کو محض انسان ہی مانیں تو بھی اُن کا یہ اعتراض قائم رہیگا۔ اگر مسیح وہ ہے جو وہ اُسے مانتے ہیں۔ یعنی طبقہ انسانی کا مرکز اور نمونہ اور سب بنی آدم میں اعلےٰ وافضل۔ ہاں اگر وہ پفلیڈر کے قیاس کے مطابق سچے مذہب کے اصولوں کا مظہر ہے یا اگر وہ شلائر منچر کی رائے کے مطابق کامل طور پر کامل انسان ہے جس میں کہ الٰہی شناخت مکمل صورت میں نظر آتی ہے۔ یا اگر یسی اس کے قول۔ مطابق وہی اکیلا تمام بنی نوع آدم میں لوث گناہ سے مبرا ہے تو ہم پوچھتے

کہ یہ دعاوی کونسے ہلکے دعاوی ہیں؟ جب ہم اس کی پستی اور تواریخی ہیچ میرزی پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی نسبت یہ دعوے بھی ایسے ہی مشکل معلوم ہوتے ہیں جیسے یہ دعوے کہ وہ ایک الٰہی شخص تھا +

اور اگر حامیانِ اصول ارتقا میں سے کوئی شخص یہی اعتراض کرے۔ تو ہم اُسے یہ کہینگے۔ کہ اگر اس کو تجسم کی تعلیم عجیب معلوم ہوتی ہو۔ تو وہ اس کا مقابلہ اپنے مقبول خیالات سے کرے اور دیکھے کہ اسکے دعوے زیادہ عجیب ہیں یا یہ بات کہ خدا یسوع مسیح میں مجسم ہوا۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ میں یہ نہیں مان سکتا۔ کہ ناصرت کے ایک نہایت پست انسان میں الوہیت کی تمام طاقتیں موجود تھیں۔ لیکن دیکھو کہ وہ ہم سے خود کیا منوانا چاہتا ہے؟ وہ ہم کو قدیم زمانوں کے شروع میں لے جاتا اور وہاں ایک قطرہ پروٹوپلازم (مادے کا ذرہ جس میں اس کے زعم میں زندگی پنہاں ہے) کا دکھا کر کہتا ہے کہ زندگی کی تمام طاقتیں اور قابلتیں اس میں موجود ہیں جو زمانہائے مابعد میں اپنی ارتقائی منازل میں نمودار ہونگی۔ کہ زندگی کے اس نہایت ہی چھوٹے سے محل میں نہ صرف نباتاتی زندگی کی دولت نہاں ہے۔ نہ صرف ادنےٰ اور اعلیٰ قسم کے حیوانات کی جسمانی طاقتوں اور عقلِ حیوانی کی قوتوں کے نمودار ہونے کی امیدیں اس میں منجمد ہیں۔ بلکہ انسانی طاقتوں کے امکانات بھی اس قطرے یا جھلی میں موجود ہیں۔ جو کچھ انسانی طبقہ میں اب تک نمایاں ہوا ہے۔ یعنی انسانی لیاقت کے خزانے۔ اور سویلیزیشن (تہذیب) کے دفینے۔ عقل اور واہمہ اور جذبات انسانی کے جواہر محبت اور نیکی کے موتی۔ شاعری اور حرفہ کے لعل۔ غرضیکہ ڈنٹی اور شکسپئیر اور ملٹن کی لیاقت۔ مسیح کی روحانی عظمت اور پاکیزگی کے گوہر شاہوار یہ سب کچھ اس نقطۂ ساں پروٹوپلازم میں پایا جاتا ہے۔ جب ہم اس دعوے کو مسیحی دعوی کے مقابلہ میں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ دعوی عجیب سا تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے ارتقائی حقیقت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ پست حال مسیح میں خدا کا مجسم ہونا عجیب سا تو معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس سے تجسم کی

حقیقت میں بھی کسی طرح فرق نہیں آتا۔ اس سوال کا فیصلہ اس نتیجہ پر معلق
نہیں جو اپنے موہومہ قضیوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی صداقت کی
پڑتال حقائق نفس الامری سے آنی چاہیئے +

ا۔ گوڈے صاحب فرماتے ہیں۔ کہ "مسیحی مذہب کلیۃً طور پر اس شناخت
پر مبنی ہے۔ جو مسیح اپنی ذات کی نسبت رکھتا تھا۔ اور کہ یہ ایمان کی بہادری
ہے کہ وہ اس عجیب گواہی پر تکیہ کرتا ہے جو یہ شخص اپنی نسبت آپ دیتا ہے"
یہ بات بالکل برحق ہے اور اس کی دلیل مسیح خود دیتا ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ
وہی اکیلا وہ علم رکھتا ہے جو اس کا (مسیح کا) صحیح تخمینہ لگانے کے لئے ضرور
ہے۔ چنانچہ اُس نے فرمایا۔ "میں جانتا ہوں کہ میں کہاں سے ہوں۔ اور کہاں
جاتا ہوں"۔ لیکن ہم اس جگہ تحقیق کا سلسلہ مسیح کے اقوال سے شروع
نہیں کرینگے۔ ہم اس سلسلے کو اُس زمانہ سے شروع کرینگے جس زمانہ سے ہمارے
سب سے قدیم نوشتے علاقہ رکھتے ہیں اور یہ دریافت کرینگے کہ رسولوں کے زمانہ
میں مسیح کی شخصیت کی نسبت لوگوں کی کیا رائے تھی؟ اس زمانہ کی گواہی نہایت
ضروری ہے کیونکہ اُس سے ظاہر ہو جائیگا کہ مسیح کا دعوےٰ اپنی نسبت کیا تھا
لوگ اکثر کہا کرتے ہیں۔ کہ بودھ کے پیروؤں نے بھی تو آخرکار اُس کو ایک الٰہی
شخص بنا ہی لیا۔ حالانکہ اُس نے کبھی اُلوہیت کا دعوےٰ نہیں کیا تھا۔ ہم
اس کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ ان دو باتوں میں کسی طرح کی مماثلت
اور مشاکلت نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ بودھ کو اس کے شاگردوں نے کئی صدیوں
بعد خدا کے درجہ تک پہنچایا۔ مگر مسیح کی الوہیت کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے جس
وقت وہ بذات خود تعلیم دیتا تھا۔ اگر اس وقت سے ہم ایک قدم آگے بڑھیں
تو ہم اس کلیسیا میں داخل ہو جاتے ہیں جسے اس کے شاگردوں نے قائم کیا
تھا۔ اور جو ہر جگہ اُس کو خدا کا بیٹا سمجھ کر اس کی عبادت اور پرستش کیا کرتی تھی
اب اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہم کو ماننا پڑے گا کہ عقیدہ مسیح کے دعووں پر مبنی
تھا۔ اور اس کی ذات کے تواریخی اظہار سے پیدا ہوا تھا +

اس سلسلۂ تحقیق کو ہم اسوقت ایک ایسی دلیل سے شروع کرتے ہیں جس پر کسی طرح کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ یہ ہے کہ مسیحی مذہب کی ابتدا میں تمام مسیحی اِن باتوں کو مانتے تھے کہ مسیح مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے۔ آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ خدا تعالےٰ کے دہنے ہاتھ بیٹھا ہے۔ دُنیا پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور آسمان سے زندوں اور مُردوں کا انصاف کرنے کو پھر آئیگا۔ اور کہ انہیں باتوں کے سبب سے مسیح اس لائق سمجھا جاتا تھا۔ کہ کلیسیا میں اس کی عبادت اور بندگی کی جائے اور اُس کے حضور دُعا کے لئے ہاتھ بلند ہوں۔ نئے عہد نامہ کی تمام کتابوں میں خداوند مسیح اسی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً اعمال کی کتاب اور پولوس کے خطوط۔ اور عبرانیوں کے خط اور پطرس کے خطوط اور مکاشفات کی کتاب میں۔ یوحنا اور یعقوب اور یہودا کے خطوط میں وہ انہیں صفات کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور یہ بات ایسی متحقق اور مسلم ہے کہ ہمیں اس کی تصدیق کے لئے خاص خاص آیات کے اقتباس کرنے کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔ اب اِن باتوں پر غور کر کے آپ فرمایئے کہ ان باتوں سے کیا مترشح ہوتا ہے؟ کیا ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مسیح محض انسان نہ تھا؟۔ کیا ان سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ایک فوق العادت انسان تھا؟ صرف اسی ایک دعوے پر غور کیجیئے۔ کہ وہ تمام دنیا کا انصاف کرنے والا ہے کہ تمام بنی آدم کے ابدی انجام کا فیصلہ کرنے والا وہی ہے۔ نئے عہد نامہ کے مصنف اور کسی بات پر ایسے متفق نہیں ہیں۔ جیسے اِس بات پر کہ مسیح ہمارا انصاف کرنے کو پھر آئے گا۔ قدیم مسیحی خواہ اس بات کو سمجھتے یا نہ سمجھتے ہوں۔ کہ یہ عقیدہ کیا معنے رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ اس کام کے لئے ایسی صفات (مثلاً عالم الغیبی) کی ضرورت ہے۔ جو ذات باری سے خاص ہیں۔ پھر ایک اور اُبھری ہوئی بات لیجیئے۔ اور وہ مسیح کی عبادت ہے۔ جو نئے عہد کی کتابوں میں مثلاً مکاشفات کی کتاب میں مسیح کا حق نظر آتی ہے۔ کسی شخص کے سامنے جو

محض انسان ہو کر نا اور اُس کی عبادت کرنا نئے عہد نامہ کی تعلیم کے خلاف ہے پس مسیح کی عبادت دیکھ کر ہم صرف ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہیں اور وہ یہ کہ شروع ہی سے اس کی شخصیت کا جزو اعلیٰ اُس کی الوہیت سمجھی جاتی تھی۔ یعنی کلیسیا یہ مانتی تھی۔ کہ وہ اپنی ذات سے ایک الٰہی شخص ہے +

رسولوں کی گواہی کی نسبت اب کسی طرح کے شکوک باقی نہیں رہے کیونکہ زمانۂ حال کے تمام بے ریا مفسر اس بات پر متفق ہیں کہ نئے عہد نامہ کی مختلف کتابوں میں وہی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ جو کلیسیا مسیح کی ذات اور شخصیت کی نسبت مان رہی ہے۔ جن نوشتوں میں اُس کی الوہیت کی خبر پائی جاتی ہے۔ ان پر جو ملمع یونی ٹیرین کیا کرتے تھے۔ وہ اب بے آب ہو گیا ہے پس اب کوئی شخص یہ اعتراض نہیں کرتا کہ پولوس اور یوحنّا کی کتابوں میں مسیح کی فوق العادت شخصیت کی گواہی نہیں ملتی۔ یوحنّا کی انجیل اور خطوط میں تو مسیح کی ذات اور شخصیت کے متعلق سب سے اعلےٰ گواہی دستیاب ہوتی ہے۔ اس بات کو ڈاکٹر مارٹی نو جیسے زبردست مخالف مفسر بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ چنانچہ مارٹینو صاحب کہتے ہیں۔ کہ الفاظ "خدا کا بیٹا" جو چوتھی انجیل میں ازلی کلمے کی نسبت استعمال کئے گئے ہیں۔ وہ تمام محدود تشبیہوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ مندرجہ ذیل بہت ہی غور طلب ہیں۔ "انجیل یوحنّا میں جو باہمی یگانگت کلمہ (یا بیٹے) اور خدا کے درمیان دکھائی گئی ہے وہ فقط اس مشابہت کی مانند نہیں۔ ہے جو انسان یا فرشتے کی خصلت اور خیالات خدا کی خصلت اور خیالات کے ساتھ رکھتے ہیں وہ تو ذات کی یکسانیت کی یگانگت ہے جس کے سبب سے مسیح نہ صرف مانندِ خدا بلکہ خود خدا مانا جاتا ہے۔ دوسرے لوگ اخلاقی معنوں میں خدا کے فرزند ہوں تو ہوں۔ مگر ذاتیت کے اعتبار سے فقط مسیح ہی اکیلا اس کا فرزند ہے۔ اس خصوص میں وہ اُس کا اکلوتا بیٹا ہے۔ لہٰذا وہ اُس سے جُدا نہیں بلکہ وہ خدا کے جس کی زندگی اُس میں ظہور پذیر ہے نہایت ہی نزدیک ہے۔

ایسا کہ وہ "باپ کی گود" میں بتایا گیا ہے۔ ہاں اس انجیل کی اس عبادت سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اس یگانگت سے کہیں بڑھ کر ہے جو انسان اور خدا میں اس وقت نظر آتی ہے۔ جبکہ انسان تابعدار دل سے خدا کی مرضی اور محبت کے مطابق عمل کرتا ہے (اور یُوں ظاہر کرتا ہے کہ وہ طبیعت میں خدا کی مانند ہے کیونکہ اُس کی مرضی اور محبت خدا کی مرضی اور محبت کی طرح ہے) اس عبادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو شخص ہیں جو ہمجنس اور ہمذات ہیں۔ کہ دونوں واحد ہیں اور دونوں خدائیت کے لئے ایسے ضروری اور لازمی ہیں۔ کہ الوہیت کی نسبت خواہ کسی صداقت کا ذکر کرو۔ اِن میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے۔ وہی کلمہ جو ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ وقت معینہ پر انسانی صورت میں نمودار ہوا۔ اُسی نے باپ کی کمالیتوں اور معموریوں کو جہاں تک کہ وہ انسان سے متعلق ہیں ظاہر کیا۔ اس نے اس کام کو انجام دینے کے بعد اپنی ازلی زندگی کی طرف پھر عود کیا۔ بمعہ اُن نئے رشتوں کے جو اُس کے تمام شدہ کام سے پیدا ہوئے ہیں" (منقول از سینٹ آف انتھاریٹی) پس مقدس یوحنا کی انجیل کے متعلق جو سوال برپا ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے چنداں علاقہ نہیں رکھتا۔ کہ اس انجیل میں کیا تعلیم پائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق بیشتر اس سوال سے ہے کہ یوحنا رسول جو کچھ بیان کرتا ہے وہ فی الحقیقت مسیح خداوند کے کام اور فرمان کا اصل بیان ہے یا نہیں۔ ہم بہتر سمجھتے ہیں۔ کہ ہم ابھی اس معاملہ پر اپنی رائے نہ دیں۔ بلکہ پہلے یہ دکھائیں کہ کیا دیگر رسول بھی مسیح کی ذات و شخصیت کی نسبت بداہتاً یا دلالتاً اسی قسم کی تعلیم دیتے ہیں کہ نہیں +

اس سوال کے حل کرنے میں جو کتابیں ہماری مدد کر سکتی ہیں وہ پولوس رسول کے خطوط ہیں۔ جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ واضح ہو کہ پولوس رسول کے اُن خطوط کی تعلیم کی نسبت جن کی اصلیت پر کبھی کسی طرح کی نکتہ چینی نہیں کی گئی۔ بالعموم یہی مانا جاتا ہے کہ انہیں مسیح کے الٰہی درجہ

کے متعلق نہایت پُرزور بیان پایا جاتا ہے۔ مثلاً تمام صدق دوست مفسر مانتے ہیں کہ مقدس پولوس کے خطوط میں مسیح کے متعلق ذیل کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ کہ مسیح ازل میں موجود تھا۔ اور کہ اُس کا لقب "خدا کا بیٹا" اُس رشتہ کو ظاہر کرتا ہے جو وہ ازل سے باپ کے ساتھ رکھتا ہے۔ کہ اُس میں الٰہی ذات پائی جاتی ہے۔ کہ خلقت کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ کہ وقت کے پورا ہو جانے پر اُس نے انسانی ذات کو اختیار کیا۔ اور کہ اپنی موت اور قیامت کے بعد وہ پھر اپنے الٰہی جلال اور طاقت سے مالا مال ہوا۔ لیکن زمانہ حال کے بعض اشخاص نے پولوس رسول کی تھیالوجی کو توڑ مروڑ کر کسی اور ہی رُخ پر ڈال دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ کہ پولوس کے پہلے خطوط میں جس میں آسمانی اور ازلی الٰہی ذات والے "خدا کے بیٹے" کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہ کوئی دوسرا علیحدہ الٰہی شخص نہ تھا۔ جیسا کہ عام مسیحی مانتے ہیں۔ بلکہ اُس سے ایک ازلی "آسمانی انسان مُراد ہے۔ جو مرتبہ میں ادنےٰ ہے۔ مگر خدا کی رُوحانی صورت رکھتا ہے۔ اور اصل انسانیت کا آسمانی نمونہ ہے۔ واضح ہو کہ یہ ایک ایسا تصور ہے جس کا بیان کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ جتنا اس کا سمجھانا مشکل ہے۔ بعض علما نے اسی خیال کو کہ مسیح ایک "آسمانی انسان" ہے (یعنی ایسا انسان۔ جیسا کہ آسمان چاہتا ہے کہ انسان ہو) بڑے شوق سے قبول کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ پولوس رسول نے مسیح کی ذات اور شخصیت کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل کلیتہً اسی خیال میں پائی جاتی ہے مثلاً ہالے کے بیلج صاحب اِسی خیال کو اپنے دعوے کی بُنیاد ٹھیراتے ہیں مگر وہ اس خیال والے اور لوگوں سے اِس بات میں اختلاف رکھتے ہیں کہ اور لوگ تو یہ مانتے ہیں۔ کہ پولوس ایک حقیقی شخصی اور ازلی ہستی کا ذکر کرتا ہے مگر بیلج صاحب یہ مانتے ہیں۔ کہ پولوس محض نمونہ کی خاطر ایک ازلی آسمانی وجود کا ذکر کرتا ہے اور اُسے وہ خدا کا بیٹا کہتا ہے۔ ہم اس دعوے کو علم تشریح یا علم تفسیر کا ایک بے بُنیاد دعویٰ خیال کرتے ہیں۔ جو صرف ایک آیت کے

الفاظ پر معلّق ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ "دوسرا آدم آسمان سے"۔ یہ دعوے کلام کی دیگر تعلیمات کے سراسر برخلاف ہے۔ اور زیادہ سمجھدار اور روشن ضمیر مفسر اس دعوے کو نہیں مانتے۔ وہ یہی مانتے ہیں۔ کہ "خدا کے بیٹے" سے ایک الٰہی شخص مُراد ہے۔ واضح ہو کہ پولوس کے بیان کے مطابق مسیح انسانیت تو رکھتا ہے۔ مگر وہ اُس انسانیت کو آسمان سے اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ اُس کی انسانیت وہ انسانیت ہے جو اُس نے زمین پر آکر اختیار کی +

یہ دعوے کہ مسیح ایک آسمانی انسان تھا۔ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ جب ہم پولوس کے اُن خطوط پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو اُس نے پیچھے لکھے۔ اور وہ فلپیوں افسیوں اور کلسیوں کے خطوط ہیں۔ ان کی اصلیت پر کسی کو کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے۔ فلپیوں کا خط لیجئے اور دیکھیئے۔ کہ آیا اس میں مسیح کی ازلی الٰہی ذات کے متعلّق صاف اور پر زور بیان پایا جاتا ہے یا نہیں۔ دوسرے باب کی پانچویں آیت سے گیارھویں آیت تک جو دلیل پائی جاتی ہے۔ وہ سراسر مسیح کے اُس الٰہی جلال پر مبنی ہے۔ جو وہ ازل ہی سے رکھتا تھا۔ وہ "خدا کی صورت" پر تھا اور اپنی رضامندی سے اُس نے اُس جلال کو چھوڑ کر "انسان کی صورت" اور "غلام کی شکل" اختیار کی وغیرہ۔ اور اگر افسیوں اور کلسیوں کے خطوں پر غور کرو۔ تو ماننا پڑے گا۔ کہ مذکورۂ بالا دعوے کے مؤید بھی ان خطوں کی تعلیم پر کسی طرح کا اعتراض نہیں کرتے۔ چنانچہ **لیپسی اس** صاحب کہتے ہیں کہ ان خطوں میں مسیح جسے خدائی صورت۔ اور تمام خلقت کا پلوٹھا کہا ہے۔ فی ذاتہ ایک الٰہی شخص ہے اور دُنیا کی خلقت کا وسیلہ۔ **پفلیڈر** صاحب کے قیاس میں پولوس کی اس قسم کی عبادتوں میں یہودی فیلو کے **لاگاس** (کلمہ) کا فلسفہ اُسی طرح عکس فگن ہے جیسا کہ وہ یوحنا کی انجیل میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم تو اس بات کے قائل نہیں۔ پر اگر بفرض محال اسے مان بھی لیں تو بھی اس سے کیا ظاہر ہوگا؟۔ یہ کہ پولوس کے خطوط اور یوحنا کی انجیل میں کسی طرح کا فرق اس خصوص میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ سراسر مطابقت نظر آتی ہے

اِنہیں تین خطوں پر کیا منحصر ہے۔ پولوس رسول کے تمام خط کیا پہلے لکھے ہوئے اور کیا کچھ دیر بعد کے۔ سب کے سب مسیح کی نسبت یہی گواہی دیتے ہیں کہ وہ "خدا کا بیٹا" ہے جو ازل سے باپ کے جلال میں شامل ہے۔ اور جو وقت معینہ پر ہماری نجات کے لئے انسان بنا۔ وہ سب یہی بتلاتے ہیں کہ وہ دُنیا کے پیشتر موجود تھا۔ اور کہ دنیا کو اُسی نے بنایا ہے۔ کہ وہی الٰہی مقصد کا مرکز ہے۔ کہ ساری چیزیں اُسی سے ہیں اور اُسی کے لئے ہیں۔ یہ ایسی تعلیمات ہیں جو رومیوں اور قرنتیوں کے خطوط میں اُسی طرح موجود ہیں جس طرح کہ وہ افسیوں اور کلسیوں کے خطوں میں پائی جاتی ہیں۔ سب خطوں میں وہ **خداوند** (یونانی Κυριος) کہلاتا ہے۔ پرانے عہد نامہ میں جو باتیں یہوواہ کے حق میں کہی گئی ہیں وہی ان خطوں میں مسیح کے حق میں مرقوم ہیں۔ وہ الٰہی عزت سے ممتاز ہے۔ وہ دُنیا پر الٰہی اختیار رکھتا ہوا نظر آتا ہے۔ خطوط کے شروع میں اُس کا نام باپ کے ساتھ آتا ہے۔ اور وہ دونوں فضل اور سلامتی کا چشمہ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر رسولی دُعا میں اُس کا نام باپ اور رُوح کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ اُس کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ دُنیا کا منصف ہونے کے اعتبار سے دلوں کے جانچنے والا ہے۔ (رومی ۲: ۱۶ و ا قرنتی ۴: ۵) اب اگر ہم ان تمام باتوں پر لحاظ کریں۔ اور اس بات کو بھی مدِّنظر رکھیں۔ کہ پولوس جیسے شخص کے لئے جو کہ وحدانیت کا ماننے والا تھا متذکرہ بالا صفات الٰہیہ کا ایک عام انسان کے متعلق ماننا ناممکن تھا۔ ہاں اگر ہم اِن باتوں کو یاد رکھیں تو یہ ماننا مشکل نہ ہوگا۔ کہ رسول کے اعتقاد میں مسیح سچ مچ ایک الٰہی شخص تھا جو باپ سے شخصیّت میں الگ مگر ذات میں اُس کے ساتھ ایک ہے۔ پر جو بات اس جگہ ہم روشن کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ پولوس جب مسیح کی نسبت اِن اعلیٰ الٰہی صفات کا ذکر کرتا ہے تو ایسے طور پر نہیں کرتا۔ کہ گویا وہ ایک نئی تعلیم دے رہا ہے۔ بلکہ وہ ایسے طور پر بولتا ہے کہ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے درجہ اور شان کی نسبت جو کچھ وہ مانتا ہے

وہی اُسکے مکتوب الیہ مانتے ہیں۔ کسی جگہ اُس کے خطوط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مسیح کی ذات و صفات کی نسبت وہ لوگوں سے کچھ منوانا چاہتا ہے جو وہ آگے نہیں مانتے۔ مسیح کی الوہیت کا اظہار اُس کا خاص مکاشفہ نہیں ہے وہ تو ایک ایسی صداقت ہے جس کے وارث وہ اور اُس کے مکتوب الیہ دونو برابر ہیں۔ وہ ایمان سے راستباز ٹھیرائے جانے کی تعلیم کو طویل اور بسیط دلائل سے ثابت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مگر مسیح کی الوہیت کے ثابت کرنے کے لئے وہ ایک لفظ بھر دلیل کی صورت میں نہیں لکھتا۔ خواہ وہ اپنے نومریدوں کو لکھے یا ایسی کلیسیاؤں کو جنہیں اُس نے کبھی نہیں دیکھا بہر حال وہ اس یقین کے ساتھ لکھتا ہے کہ مسیح کی الوہیت اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ میرے قلم سے نکل رہا ہے اس پر نہ کوئی کسی طرح کا شک کرے گا اور نہ کسی قسم کا اعتراض۔ اب اس سے ہم کیا نتیجہ نکالیں؟ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قدیم کلیسیا میں مسیح کی شخصیت کی نسبت جو تعلیم مروج تھی وہ ابیونی نہ تھی؟ کہ شروع ہی سے کلیسیا اس کی الوہیت کی قائل ہے +

واضح ہو کہ علم الٰہی کے اس مسئلہ پر رسول جو گواہی دیتے ہیں اُنکی تائید میں فقط پولوس ہی کے خطوط پیش نہیں کئے جاتے بلکہ اور گواہیاں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً عبرانیوں کا خط لیجئے۔ اس خط میں بھی یہی تعلیم ملتی ہے ایک مدت تک لوگ اِس خط کو پولوس کی تصنیف سمجھتے رہے۔ مگر اب بالعموم مانا جاتا ہے کہ یہ خط پولوس کی تصنیفات سے نہیں بلکہ کسی اور شخص کا لکھا ہوا ہے۔ پس اس کی شہادت پولوس کی گواہی سے الگ اور آزاد سمجھنی چاہیئے۔ علاوہ بریں اِس خط کی گواہی اس لئے بھی قابلِ قدر ہے کہ یہ بہت قدیم خط ہے۔ چنانچہ بہت سے علماء کی رائے ہے کہ یہ خط یروشلیم کی بربادی سے پہلے ۶۶ء میں تحریر ہوا۔ اس کا مصنف اگرچہ ایک ایسے پہلو پر لکھ رہا ہے جو پولوس اور یوحنا کے پہلو سے بہت مختلف ہے۔ تاہم یسوع کی

ذات اور شخصیت کی نسبت جو خیالات وہ پیش کرتا ہے وہ وہی ہیں جو پولوس اور یوحنا کی تصنیفات میں جلوہ گر ہیں۔ یعنی عبرانیوں کے مصنف کے بیان میں بھی یسوع الٰہی شخص۔ خدا کا بیٹا۔ اُس کے جلال کا عکس۔ اُس کی ذات کی ماہیت۔ تمام اشیا کا خالق اور سنبھالنے والا۔ اور ساری چیزوں کا وارث مانا گیا ہے۔ اس کی نسبت لکھا ہے کہ "جس طرح لڑکے خون اور گوشت میں شریک ہیں وہ خود بھی اُن کی طرح اُن میں شریک ہوا۔ اور اب عالم بالا پر جناب باری کی دہنی طرف بیٹھا ہے"۔ اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ اس خط کا مصنف جب خداوند یسوع کی نسبت یہ باتیں تحریر کرتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ میں کوئی نئی تعلیم نہیں دے رہا ہوں بلکہ وہی باتیں لکھ رہا ہوں جنہیں ساری کلیسیا پہلے ہی سے مان رہی ہے پس یہ مصنف مانی ہوئی باتوں کا اعادہ کرتا ہے اور اس غرض سے کہ کلیسیا اُن کو مضبوطی سے تھامے رہے +

لیکن لوگ کہتے ہیں کہ عبرانیوں کے خط میں مسیح کی ذات اور شخصیت کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ پولوس کے خیالات سے بہت ملتا جلتا ہے اس لئے یہ سوال برپا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسی گواہی بھی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ جو لوگ یہودیوں سے عیسائی ہوئے تھے وہ بمقابلہ ان لوگوں کے جو غیر اقوام سے مسیحی ہوئے تھے یسوع کی شخصیت اور ذات کے بارے میں یہ یہ باتیں مانتے تھے۔ اس سوال کا جواب ایک اور کتاب میں ملتا ہے جو کہ رسولوں کے زمانہ سے وابستہ ہے اور جس کی قدامت پر اب کوئی نکتہ چین اعتراض نہیں کرتا۔ بلکہ وولکمز جیسے نکتہ چین تو یہ مانتے ہیں کہ وہ خاصکر پولوس کی مخالفت کے لئے لکھی گئی تھی۔ ہماری مراد مکاشفات کی کتاب سے ہے جو بڑے بڑے نقادوں اور نکتہ چینوں کی رائے کے مطابق نیرو کی عہد حکومت کے ختم ہوتے ہی تحریر ہوئی۔ اور جس کی نسبت معترضین یہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ پولوس کی تعلیم کے مخالف ہے اور بڑے زور سے یہ دعوے کرتے ہیں +

پس اس کتاب کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب قدیم زمانہ کے یہودی مسیحیوں کے خیالات کا مجموعہ ہے۔ اب دیکھئے کہ یہ کتاب مسیح کی شخصیت کی نسبت کیا کہتی ہے۔ جب ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں بھی مسیح خداوند کی شخصیت کے متعلق وہی اعلےٰ خیال پایا جاتا ہے جیسا کہ پولوس اور یوحنا کی دیگر تصنیفات میں نظر آتا ہے ریوس صاحب جو ایک غیر متعصب شخص ہیں اس طرح لکھتے ہیں۔ "پولوس رسول کی تصنیفات جو کہ ہمیں کلیسیا کے گہوارے تک لیجاتی ہیں جب منصۂ شہود پر جلوہ نما ہوئیں تو اُن کو لوگوں نے کوئی نئی تعلیم نہیں سمجھا اور نہ اُن کے متعلق کلیسیا میں کسی قسم کا بحث مباحثہ جاری ہوا۔ علاوہ اس کی کتابوں کے ہمارے ہاتھ میں ایک اور کتاب ہے جو یہودی عیسائیوں کے خیالات کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس سے بھی ہمارے دعوے کو تقویت اور تائید ملتی ہے۔ وہ کتاب مکاشفات کی کتاب ہے۔ اس میں بھی مسیح خدا کا ہمتا نظر آتا ہے۔ وہ اوّل و آخر۔ الفا اور اُمگا کہلاتا ہے۔ اور انہیں القاب سے حق تعالےٰ ملقب کیا جاتا ہے"۔ اور پفلیڈرز صاحب اس نکتہ کو ایسے زور اور توضیح کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اُن کے الفاظ جو ذیل میں درج ہیں قابلِ توجہ ہیں۔ "جس طرح پولوس کی تعلیم کے مطابق مسیح الٰہی درجہ رکھ کر تمام دنیا پر حکمران ہے۔ اُسی طرح مکاشفات کے مصنف کی یہ تعلیم ہے کہ مسیح باپ کے دہنے ہاتھ تخت پر متمکن ہے اور یوں اُسکی الٰہی حکومت میں اُس کا حصہ دار ہے۔ وہ اپنی کلیسیاؤں کا مالک ہے۔ اُنکے ستاروں یا محافظ فرشتوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اور قوموں کا حاکم اور شاہوں کا شہنشاہ ہے۔ وہ لامحدود حکمت رکھنا اور قادر مطلق خداوند اور اُمتوں کا انصاف کرنے والا ہے۔ وہی اُس عبادت کا سزاوار ہے جو خدا کا حق ہے۔ مکاشفات کا مصنف جس طرح مسیح کو معبود کی صورت میں پیش کرنے میں پولوس پر سبقت لے جاتا ہے اسی طرح وہ اُس کی ذات کے

متعلق تعلیم دیتے ہوئے کسی طرح اُس سے پیچھے نہیں رہتا۔ جس طرح پولوس کو الٰہی معنوں میں خدا کا بیٹا کہتا ہے۔ اُسی طرح وہ بھی اُس کو خدا کا بیٹا بتلاتا ہے۔ چنانچہ جس صورت میں پولوس ابن آدم کو خدا کی صورت اور خلقت کا صانع۔ ہر انسان کا سر اور سردار۔ اور بالآخر تمام کائنات کا خدا قرار دیتا ہے۔ اسی طرح مکاشفات کا مسیح الٰہی اوصاف کے ساتھ اپنے آپ کو ہم پر ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً اُسکی نسبت لکھا ہے۔ "خداوند خدا جو ہے۔ جو تھا اور جو آنے والا ہے۔ یعنی قادر مطلق فرماتا ہے کہ میں الفہ اور اُمگہ ہوں"۔ وہ خلقت کا مبداء اور خدا کا کلمہ یعنی خلقت کے شروع سے لیکر انصاف کے دن تک وہی خدا کے مکاشفہ کا وسیلہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ اس کتاب کا مصنّف مسیح کی ذات اور صفات اور شخصیت کی نسبت بیان کرتا ہے اُس میں اور پولوس کے بیان میں سر مو فرق نہیں ہے اس کتاب کا مسیح پولوس کے مسیح کی مانند زمینی ابن آدم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے"۔

اوپر کے غیر مسیحی مصنّفوں کے بیان اور پولوس اور مکاشفات کی گواہی کے بعد ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہم پطرس اور دیگر چھوٹے چھوٹے خطوط کی شہادت بھی پیش کریں۔ مگر پڑھنے والے کے فائدہ کیلئے ہم اُن کی گواہی بھی مختصراً پیش کئے دیتے ہیں۔ پطرس کا کلام اس معاملہ میں بالکل صاف ہے۔ اور جو گواہی اوپر قید کتابت میں آچکی ہے۔ اُس سے پُوری پوری موافقت رکھتا ہے۔ مثلاً پطرس کے پہلے خط کی رو سے مسیح نجات کے کام میں باپ اور رُوح القدس کے برابر ہے (۱ پطرس ۱: ۲) وہ بنائے عالم سے پیشتر نجات دہندہ ہے مگر ظہور اُس کا آخری زمانہ میں ہوا (۱ پطرس ۱: ۲۰) اُس کی رُوح پیشتر سے نبیوں میں گواہی دیتی تھی۔ (۱ پطرس ۱: ۱۱) وہ SO حم ے K یعنی خداوند ہے۔ اور پُرانے عہد نامہ میں۔ جو مقامات یہواہ پر عائد ہوتے ہیں وہ اُس پر چسپاں کئے جاتے ہیں۔ خصوصاً ۱ پطرس ۳: ۱۵ کو دیکھو جہاں لکھا ہے۔ "مسیح کو خداوند جانکر اپنے دلوں

CamScanner

یں مقدس سمجھو"۔ وہ آسمان میں ہے۔ خدا کی دہنی طرف بیٹھا ہے۔ اور فرشتے اور اختیارات اور قدرتیں اُس کی تابع کی گئی ہیں (۱ پطرس ۳: ۲۲) وہ "زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے والا ہے"۔ پس وہ اپنی عظمت میں ایک الٰہی شخص ہے۔ پھر یعقوب کے خط کو لیجئے۔ وہ بھی مسیح کو "خداوند ذوالجلال" اور دنیا کا منصف بتلاتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ دُعا اس کے نام سے ہونی چاہیئے۔ (یعقوب ۲: ۱ و ۵: ۷۔ ۹ و ۱۴ و ۱۵) حالانکہ وہ اپنے خط میں مسیح کی ذات اور شخصیت کی نسبت کچھ نہیں لکھتا ہے پھر یہوداہ کے چھوٹے سے خط میں جو اشارے مسیح کی عظمت کی نسبت پائے جاتے ہیں وہ بھی کچھ کم معنی خیز نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ خداوند مسیح کی نسبت لکھتا ہوا اُسے "ایک ہی مالک اور **خداوند** یسوع مسیح" کہتا ہے۔ اور ایمانداروں کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ رُوح القدس میں دُعا مانگیں۔ اور اپنے آپ کو خدا کی محبت میں قائم رکھیں۔ اور ہمیشہ کی زندگی کے لئے ہمارے خداوند یسوع مسیح کی رحمت کے منتظر رہیں اور اپنے خط کے آخر میں خدائے واحد کی طرف جو ہمارا منجی ہے۔ یسوع مسیح کے وسیلے جلال اور عظمت اور سلطنت اور اختیار منسوب کرتا ہے (یہوداہ ۱۴ و ۲۰ و ۲۱ و ۲۵) اب اگر ان شہادتوں پر وہ تقریریں اضافہ کریں جو کہ اعمال کی کتاب میں پائی جاتی ہیں تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ مسیحی مذہب کے سب سے قدیم زمانہ میں کلیسیا مسیح کی ذات و صفات اور شخصیت کی نسبت کیا رائے رکھتی تھی۔ اگرچہ ان تقریروں میں مسیح کی شخصیت کی اصل اور حقیقت کے بارے میں کوئی خاص عقیدہ تعلیم کی صورت میں پیش نہیں کیا گیا۔ تاہم ان میں اُن کے لاثانی جلال کا (اعمال ۳: ۱۳ و ۲۵) ذکر پایا جاتا ہے۔ وہ اُسے خدا کا قدوس اور بے گناہ بتاتی ہیں (اعمال ۳: ۱۴) وہ گواہی دیتی ہیں کہ یہ ناممکن تھا کہ وہ موت کے قبضہ میں رہے (اعمال ۲: ۲۴) اُنکے مطابق وہ زندگی کا مالک ہے وہ تمام دنیا کی حکومت کے تخت پر متمکن اور

ممتاز ہے۔ (اعمال ۲: ۳۶ و ۳: ۱۵) اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وہ خداوند ہے جس کے نام سے دُعا مانگنی چاہیئے کہ اُسی اکیلے کے نام سے آسمان کے نیچے بنی آدم کو نجات مِل سکتی ہے۔ کہ وہی اکیلا گناہوں کی معافی بخشنے والا ہے۔ (اعمال ۲: ۲۱ و ۳۸-۳: ۲۶-۴: ۱۰-۱۲ و ۵: ۳۰ و ۳۱) وہی رُوح القدس کا دینے والا ہے (اعمال ۲: ۳۳) وہی دُنیا کا منفرد منصف ہے اور وہ آسمان میں اُس وقت تک رہیگا جس وقت تک کہ ساری چیزیں بحال نہ کی جائیں (اعمال ۳: ۲۰ و ۲۱) اگرچہ یہ بیانات بہت سادہ سے ہیں تو بھی اُس مفصل اور مکمل بیان کے خلاف نہیں ہیں جو کہ خطوط میں مسیح کی ذات اور شخصیت کے متعلق موجود ہے۔ بلکہ اس سادہ سے بیان کو ایسے قضیئے سمجھنا چاہیئے جن سے وہ تعلیم جو خطوط کے مفصّل بیان میں قلمبند ہے بطور نتیجہ اخذ کی جاسکتی ہے +

پس مسیح کی الوہیت کی تعلیم کسی مابعد زمانہ کی ساخت نہیں ہے بلکہ وہ وہ تعلیم ہے جو اُس پشت کے اندر جو کہ مسیح کی موت کے بعد اس دنیا میں موجود تھی پورے پورے طور پر کلیسیا کے دایرہ میں رائج تھی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعلیم رسولوں کی تصنیفات میں اس طرح پائی جاتی ہے کہ گویا وہ پہلے ہی سے اس کو مان رہے ہیں۔ اور اسی طرح وہ لوگ جنکی طرف اُن کے مکتوبات ارسال کئے گئے اِس کو پہلے ہی سے مانتے اور جانتے تھے۔ اگر بفرض محال ٹوبنجن سکول کے پیروؤں کے زعم کے مطابق کلیسیا میں دو فریق پولوسی اور پطرسی پائے جاتے تھے تو تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ دیگر عقائد کے متعلق اُن میں اختلاف ہو تو ہو۔ مگر اس عقیدہ کے بارے میں اُن کے درمیان کسی طرح کی مخالفت نہ تھی بلکہ کامل اتفاق پایا جاتا تھا پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اتفاق کی اصل وجہ کیا تھی ؟ اس کی اصل وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ یہ عقیدہ مسیح کی زمینی زندگی کے واقعات سے اور اُن دعووں سے جو اُس نے خود اپنی ذات و صفات کی نسبت کئے اور

نیز اس گواہی سے جو اس کے رسولوں نے مختلف کلیساؤں کے سامنے پیش کی پیدا ہوا تھا اور اُن سے پوری پوری مطابقت رکھتا تھا۔ اب ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ دیکھیں گے کہ جو باتیں خود مسیح کی زندگی کی نسبت ہمارے پاس موجود ہیں وہ کس درجہ تک اس عقیدے کی تائید اور تصدیق کرتی ہیں +

پس ہم اناجیل کی طرف متوجہ ہونگے اور دیکھیں گے کہ وہ اس امر پر کیا گواہی دیتے ہیں۔ ہم یوحنا کی انجیل کی طرف اس جگہ بہت رخ نہیں کرینگے۔ کیونکہ اس کی پہلی ۱۸- آیتوں میں اور اسی طرح ان تمام باتوں اور کاموں میں جو وہ انجیل مسیح سے منسوب کرتی ہے یہ عقیدہ آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہے۔ اور جو لوگ ہماری طرح اس انجیل کی عبادتوں کو اُن باتوں اور کاموں کا سچا بیان سمجھتے ہیں جن کا موجد اور فاعل مسیح سمجھا گیا ہے۔ اور جو اس انجیل کا مصنف اُس شاگرد کو جانتے ہیں جسے مسیح پیار کرتا تھا اُن کے نزدیک یہ عقیدہ اظہر من الشمس ہے۔ پس ہم اس جگہ اس انجیل کی اصلیت پر بحث نہیں کرینگے کیونکہ جو کچھ ہم اوپر رسولی زمانہ کے عقیدے کی نسبت تحریر کر چکے ہیں اس کو پڑھکر وہ اعتراضات رکیک اور سُبک معلوم ہونگے جو اس بنا پر کئے جاتے ہیں کہ مسیح کی ذات اور شخصیت کے متعلق جو تعلیم اس انجیل میں پائی جاتی ہے وہ دیگر مسیحی تصنیفات کی تعلیم سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ لہذا یوحنا رسول اسکندر کے فلسفہ سے موثر ہو گیا تھا۔ یہ اعتراض بالکل صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جو کچھ اس مسئلہ کے متعلق پولوس کی تصنیفات یا عبرانیوں کے خط یا مکاشفات میں پایا جاتا ہے (اور یہ تمام کتابیں رسولی زمانے کے اندر لکھی گئیں) وہ کسی صورت یوحنا کے بیان سے کم نہیں۔ اور اگر سکندریہ کے یہودی فیلسوف فیلو کی تاثیر کی نسبت پوچھو تو ہم یہ کہیں گے۔ کہ اگر یوحنا اس سے موثر ہوا تو عبرانیوں کے خط کا مصنف بھی اُس سے موثر ہوا کیونکہ اس خط میں بھی تو اسی طرح کی

تعلیم پائی جاتی ہے جیسی کہ یوحنا کی انجیل میں موجود ہے۔ پھر کیوں یوحنا کی نسبت خاص طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اس فلسفہ سے موثر ہوا اور دوسرے نہیں ہ۔ بات اصل یہ ہے کہ مسیح کی الوہیت کی نسبت جو تعلیم اس انجیل میں پائی جاتی ہے اس کا مخزن اور ماخذ دریافت کرنے کے لئے ہمیں رسولی زمانہ کے باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر ہم اس انجیل کے دیباچہ یعنی پہلی آیتوں کو علیحدہ کردیں تو باقی مسیح کے اقوال اور افعال رہ جاتے ہیں اور اُن میں فیلو کی تاثیر کی بو تک بھی نہیں آتی۔ تاہم وہ اس کی الوہیت کے شاہد ہیں۔ پس جو کچھ مسیح کی الوہیت کے متعلق اس انجیل میں پایا جاتا ہے وہ مسیحی تعلیم ہے نہ کہ فیلو کی تعلیم۔ ہارنک صاحب نے بڑے وثوق اور وضاحت سے اپنی رائے کو اس امر پر ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ "یہ بات ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی کہ فیلو کے دینی فلسفے نے یا اُس ملت نے جس کا وہ پیرو تھا قدیم مسیحیوں پر کچھ اثر ڈالا ہو۔ پولوس کی تصنیفات میں فیلو کا اثر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اور چوتھی انجیل میں جو تعلق خدا اور دنیا کے درمیان محسوس ہوتا ہے وہ فیلو کا تصور ہی نہیں ہے۔ اور اسی طرح لاگاس (کلمہ) کی تعلیم بھی دراصل فیلو کی نہیں ہے"۔ پس یہ ماننا پڑیگا کہ گو وہ تعلیم جو مسیح کے الٰہی تشخص کی نسبت اس انجیل میں پائی جاتی ہے اعلےٰ درجہ کی مکمل ہے تاہم وہ فیلو کی تعلیم نہیں ہے۔ وہ مسیحی تعلیم ہے۔

اس جگہ شاید یہ کہا جائے کہ پہلی تین انجیلیں مسیح کی زندگی وغیرہ کا جو بیان پیش کرتی ہیں وہ ایک مختلف قسم کی تصویر ہمارے سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ مخالف اکثر کہا کرتے ہیں کہ ان انجیلوں کے بیان میں ایک انسانی اور تواریخی مسیح کی فوٹو کھنچی ہوئی ہے۔ لہٰذا ان انجیلوں کا مسیح اس مسیح سے جو کہ چوتھی انجیل کے ناقابل اعتبار بیان میں نظر آتا ہے بالکل مختلف ہے۔ ڈاکٹر مارٹینو صاحب اسی بنا پر چوتھی انجیل سے منکر ہوئے۔ کیا یہ اعتراض صحیح ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر ہم کسی خاص فلسفانہ میلان یا عقیدہ کو مداخلت کرنے

نہ دیں اور بے تعصبانہ طور پر کان دھر کر ان انجیلوں کے بیان کو سنیں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ کیونکہ مسیح کی جو تصویر ان انجیلوں میں پائی جاتی ہے وہ محض ایک انسانی مسیح کی تصویر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک صورت میں تو وہ تصویر پورے پورے طور پر انسانی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے شخص کی زندگی کا خاکا پیش کرتی ہیں جو بنی آدم کے درمیان رہتا سہتا تھا۔ اُن سے دوستانہ اور برادرانہ تعلق رکھتا تھا۔ وہ غمگین ہوا۔ اُس نے دُکھ اُٹھایا۔ وہ آزمایا گیا۔ وہ غریب اور حقیر تھا۔ پس وہ ہر نہج ایک سچا "ابن آدم" تھا۔ پر کیا یہ انجیلیں مسیح کی ذاتیت کی نسبت صرف اتنا ہی کہتی ہیں اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہتی ہیں؟ کیا یہ پست حال مسیح اُن کے تمام بیان میں ایک فوق العادت شخص کی طرح حرکت نہیں کرتا اور کیا اس کی سیرت اور اس کے کام اُس کے دعاوی پر قاطع شہادت نہیں دیتے؟ کیا اس بیان میں جو پہلی تین اناجیل میں پایا جاتا ہے مسیح کی زندگی کی ابتدا کے متعلق کوئی بات غیر معمولی نظر نہیں آتی؟ کیا اُس کے آخر میں کوئی بات عام حالات انسانی سے بڑھی ہوئی دکھائی نہیں دیتی؟ اور کیا اس زندگی کے دور میں کوئی ایسی غیر معمولی باتیں ظاہر نہیں ہوتی ہیں جو اس کے غیر معمولی آغاز اور غیر معمولی انجام سے مطابقت رکھتی ہوں؟ یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا بہت سہل ہے کہ ان انجیلوں کا بیان صحیح تاریخ نہیں ہے۔ یا ان کو کاٹ کاٹ کے صرف اتنا حصہ باقی رکھ لینا جو اپنی مرضی کے مطابق ہو آسان کام ہے۔ پر لطف یہ ہے کہ جب اس درجہ تک بھی کاٹ چھانٹ کر لی جاتی ہے تب بھی جو کچھ باقی رہتا ہے وہ اسقدر کافی بلکہ وافی ہوتا ہے۔ کہ اس سے مسیح کی تعلیموں اور دعووں کا اندازہ بخوبی لگ سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جسقدر نکتہ چینی زیادہ کی جاتی ہے اُسیقدر مسیح کی فوق العادت شخصیت زیادہ چمک اُٹھتی ہے۔ کیونکہ وہ باتیں جو اس کی الٰہی شخصیت سے وابستہ ہیں وہ انجیلی

الگ کرکے مسیح کی ایک خالص سرگزشت ہمارے ہاتھ لگ جائے گی۔ نہیں یہ باتیں اس کی زندگی کی تاریخ کا ایک لاینفک جزو ہیں۔ پس اُن کو خارج کرنے سے ہمارے پاس تواریخی مسیح نہیں رہتا بلکہ وہ مسیح جسے ہمارے واہمہ نے تجویز کیا ہے۔ اب بات یہ ہے کہ دو نتیجوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ہوگا یا تو ہم یہ مانیں کہ اس کی ذات کی نسبت جو الٰہی تصورات ان انجیلوں میں پائے جاتے ہیں وہ مسیح کی حقیقی تاریخ کا حصہ ہیں اور یا سٹراس کی طرح صاف صاف یہ کہیں کہ ہم مسیح کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتے۔ مگر یہ دوسرا نتیجہ ایسا نادرست اور ناممکن ہے کہ اس کے عدم امکان کے باعث مخالف نقادوں اور نکتہ چینوں نے بار بار مجبور ہو کر اس کو ترک کیا اور پھر انجیلی تصویر کی تواریخی صداقت کو تسلیم کیا اور یوں انہوں نے اپنے آپ کو سخت مشکل میں گرفتار پا کر پھر ابن آدم کے دعووں کو سوچنا شروع کیا +

مسیح کے یہ دعاوی جو پہلی تین اناجیل میں پائے جاتے ہیں نہایت غور طلب ہیں۔ اب ہم بہ تفصیل اُن پر نظر ڈالیں گے۔ پہلے آپ لقب "ابن آدم" کی طرف متوجہ ہوں۔ مسیح کے شاگرد کبھی اس لقب سے اُس کو ملقب نہیں کرتے۔ وہ خود اس نام سے اپنے آپ کو موسوم کرتا ہے۔ جب ہم اُس کے منہ سے اس نام کو سنتے تو ہمیں اس میں ایسی تخصیص اور کچھ ایسا انوکھا پن محسوس ہوتا ہے کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا کہ جس کے دل سے یہ نام نکلتا ہے وہ جانتا ہے کہ میں انسانیت سے ایک خاص اور نرالا رشتہ رکھتا ہوں۔ کہ میں انسان کا ایک خاص طور پر ریپریزینٹیٹو ہوں۔ یعنی جس طرح آدم بنی نوع انسان کا سر ہے۔ اسی طرح میں بھی ایک خاص معنی میں انسانیت کا سر اور سردار ہوں۔ یاد رہے کہ اس لقب کے ساتھ حرف تنکیر نہیں آیا۔ یعنی وہ بنی آدم میں سے "ایک ابن آدم" نہیں ہے۔ بلکہ حرف تعریف آلؔ اس کے ساتھ آیا ہے۔ جو معنوں میں تخصیص پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح لقب "ابن اللہ" کا حال ہے۔ اس پر بھی حرف تعریف وارد ہوا ہے۔ یعنی وہ خدا

کے بیٹوں میں سے ایک بیٹا نہیں ہے ۔ بلکہ اکیلا اور خاص بیٹا ہے ۔ دیکھئے اس دوسرے رشتہ کی عظمت اور خصوصیت ذیل کے الفاظ سے کس طرح ظاہر ہوتی ہے ۔ کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہے" (متی ۱۱: ۲۷) ۔ پھر مطابق اس کی ذاتیت کی تخصیص کے جو ان القاب سے مترشح ہوتی ہے وہ مسیح ہونے کا دعوے کرتا ہے (متی ۱۱: ۱-۶ و لوقا ۴: ۱۷-۲۱) وہ نبیوں اور شریعت کا پورا کرنے والا ہے (متی ۵: ۱۷) ۔ خدا کی بادشاہت کا بانی ۔ اور اس کا اکیلا مقنن اور سردار ہے ۔ (متی ۱۳ ۔ دیکھو بادشاہت کی تمثیلیں و نیز متی ۵-۷ پہاڑی وعظ) ۔ اس سے بوسیلہ ایمان نجات ملتی ہے (متی ۱۱: ۲۸ لوقا ۷: ۵۰) ۔ وہی اکیلا انسان کے دل کی اطاعت ایسے طور پر طلب کرتا ہے جیسی کہ کوئی اور طلب کرنے کا حق نہیں رکھتا (متی ۱۰: ۳۷-۳۶) ۔ وہ گناہوں کو الہی اختیار کے ساتھ معاف کرتا ہے ۔ (متی ۹: ۲ و ۶) وہ روح القدس کا دینے والا ہے ۔ (متی ۳: ۱۱) وہ اپنی موت سے فدیہ کی خاصیت منسوب کرتا ہے (متی ۲۰: ۲۸ و ۲۱: ۲۶-۲۸) وہ پہلے ہی سے اپنی قیامت اور آسمانی جلال میں پھر داخل ہونے کی پیشین گوئی کرتا ہے ۔ (متی ۱۶: ۲۱ و ۲۷ و ۱۷: ۲۳ و ۲۰: ۱۹) ۔ وہ بتاتا ہے کہ میں دنیا کا انصاف کرنے والا ہوں (متی ۲۵: ۳۱-۴۶) ÷

واضح ہو کہ مسیح کا دعوی کہ میں دنیا کا آخری انصاف کرنے والا ہوں اور اس کا بیان پہاڑی واعظ میں بھی آتا ہے (متی ۷: ۲۱-۲۳) ۔ اور اس کا بار بار یہ کہنا کہ میں باپ کے اور اپنے اور فرشتوں کے جلال میں پھر داخل ہونگا (مرقس ۸: ۳۸) اور اس کی تمثیلیں جو عاقبت کے نقشے پیش کرتے ہوئے ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کی عاقبت کا انجام اسی کے ساتھ وابستہ ہے (متی ۲۵- لوقا ۱۲: ۱۱-۲۷) ایسی باتیں ہیں جو اس کی تعلیم کے خاص اجزا ہیں ۔ اور ہم ان کو یہ کہکر بالائے طاق نہیں رکھ سکتے کہ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ آخر کار

فتح اس کو حاصل ہوگی۔ ہماری رائے میں ان سے ایک ایسا دعوے پیدا ہوتا ہے جس کو یا تو ہم برحق مانیں اور یا مسیح کو ایک سخت فریب خوردگی کا شکار تصور کریں۔ اب ان دعاوی پر آپ ذیل کی باتیں بھی اضافہ کریں۔ پطرس اس کی بے مثل شخصیت کا اقرار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "تو مسیح زندہ خدا کا بیٹا ہے" (متی ۱۶: ۱۶ و ۱۷) وہ اس اقرار کی تردید نہیں کرتا بلکہ اسے قبول کرتا ہے۔ پھر اُن الفاظ پر غور کیجئے جو اس کی زبان حقایق ترجمان سے اس وقت نکلے جب سردار کاہن نے قسم دے کر اس سے پوچھا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو ہم سے کہدے۔ اُس نے فرمایا۔ "تو نے خود کہہ دیا" (یعنی جو حقیقت تھی تو نے خود بیان کر دی۔ میرے کہنے کی ضرورت نہیں رہی)۔ "بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کے دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے" (متی ۲۶: ۶۴) علاوہ بریں اُن بیانوں کو ملاحظہ کیجئے جن سے اس کی عالم الغیبی اور اس کا ہر جا حاضر و ناظر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ "جہاں دو یا تین میرے نام پر اکٹھے ہونگے میں اُن کے درمیان ہوں گا"۔

یہ دعاوی نہایت عظیم اور عالیشان ہیں۔ لیکن ان کو چھوڑ کر اب اس بات پر توجہ لگائیں گے کہ جو مسیح کی زندگی کی تصویر اوراق اناجیل پر منقش ہے وہ ان دعاوی سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔ اور اس کے ضمن میں ہم اس پاک تجمل پر خامہ فرسائی نہیں کرینگے جس کا ہالہ تمام حالات میں اس کی نورانی پیشانی کو مزین کر رہا ہے۔ اور نہ اس الٰہی اختیار کی نسبت کچھ کہیں گے جس سے وہ کلام کیا کرتا تھا۔ اور نہ اُس لطف و مہر پہ قلم اُٹھائیں گے جس سے اس کے تمام انسانی رشتے رنگین تھے۔ ہم صرف ایک ہی بات کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اناجیل کے بیان کے موافق مسیح ایک بیگناہ شخص تھا اور کہ اس خصوص میں وہ اور تمام بنی آدم سے نرالا تھا۔ نئے عہد نامہ کے رسول اور تمام مصنف مثلاً پولس

پطرس - یوحنا - عبرانیوں کا مصنف - مکاشفات کا مصنف بالاتفاق گواہی دیتے ہیں کہ مسیح بے گناہ تھا - اور پہلی تین اناجیل مسیح کے اس فوٹو کے وسیلے جو وہ پیش آتی ہیں اس بیان کی مصداق ہیں چنانچہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح کی زندگی کا مرکز خدا ہے - اُس کے دل میں انسانی محبت کا دریا موجزن ہے سیرت میں ہر طرح کے رنگ مناسبت تامہ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں - اور باوجود اس کے دنیا اور انسان اور تمام واقعات کے متعلق اس کی روحانی آزادی میں سر مو فرق نہیں آتا - چنانچہ وہ ہر آزمایش پر فاتح ہے اور کسی ادنیٰ اور پست اور خود غرضانہ محرک کے پھیکے سے پھیکے داغ سے بھی ملوث نہیں ہوتا - اس معاملہ میں شہادت ایسی قاطع ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسیح کی بے گناہی پر وہ لوگ بھی صاد لکھتے ہیں جن کے ظاہری اصولوں کو دیکھکر یہ خیال گزرتا ہے کہ وہ اس کے مبرا عن الخطا ہونے کے قایل نہیں ہو سکتے مثلاً ہیگل کے سکول کے پیرو مثل ڈاب - واٹکے اور ماہائے نیکے کے - اور ہر درمیانی قسم کے سکول کے عالمان علم الٰہی مثل شلائر میخر - سلخ - روڈ اور رٹشل کے - اور آزاد خیال تھیولوجن مثل ہیز اور شنکل کے اس حقیقت کے معترف ہیں - بلکہ یسی اس جیسا مخالف اعجاز بھی اس کا قایل ہے - اب ہماری بحث یہ ہے کہ اگر مسیح فی الحقیقت ایسا ہی بے گناہ تھا جیسا کہ اناجیل سے ظاہر ہوتا ہے اور جیسا کہ اُس کے شاگرد اس کو مانتے تھے تو تاریخ ہمارے سامنے ایک ایسا نظارہ لاتی ہے جو فطری اصول پر حل نہیں ہو سکتا اور نہ اصول ارتقا اس عقدہ کو وا کر سکتا ہے بلکہ اس سے ایک نئی خلقت - ایک سچا اخلاقی معجزہ ثابت ہوتا ہے جس میں اور باتیں بھی مخفی ہیں جو اس عدیم المثل شخصیت سے وابستہ ہیں جس سے بے گناہی کے اوصاف منسوب کئے گئے ہیں +

پھر دیکھئے کہ جیسی اس کی سیرت اور اُس کے دعوے ہیں ویسے ہی اس کے خادم بھی انجیلوں میں بیان ہوئے ہیں - بادی النظر میں ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی ایک فوق العادت زندگی ہے - جو معجزات اس سے منسوب

کئے جاتے ہیں وہ محض اچنبھے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ رحمت اور محبت کے کام ہیں۔ گویا وہ ایسے کام ہیں جیسے کہ اس الوہیت سے برآمد ہونے چاہئے تھے جو اُس سے منسوب کی جاتی ہے۔ مسیح انہیں اپنے نام سے اور اپنے اختیار سے وقوع میں لاتا ہے (متی ۸: ۳ و ۷۔ ۱۰ او ۲۶) اور وہ بڑی مناسبت سے اس کے "کام" کہلاتے ہیں (متی ۱۱: ۲)۔ یوحنا ہمیشہ اس کے معجزوں کو "کام" کہتا ہے) اور اس دنیا میں اُس سے اور اُس کے کام سے وہی علاقہ رکھتے ہیں جو ہمارے کام ہم سے اور ہماری حیثیت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ وہ اُس کی ذات کے باقی اظہاروں سے الگ اور جُدا ہونے کی بجائے شیر و شکر کی طرح اس کی تمام تاریخ سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ اس کی بادشاہی کی روح اور طاقتوں کے اظہار ہیں (متی ۱۱: ۴ و ۵ لوقا ۱۱: ۲۰) وہ اس کی بادشاہی کے کام یا جیسا یوحنا لکھتا ہے "نشان" ہیں۔ اسی لئے بڑے بڑے مشاق بھی اُن کو انجیل کے سلسلۂ بیان سے خارج کرنے میں قاصر نکلے ہیں۔ اُن کی جڑیں انجیلی بیان کے ساتھ لپٹی ہوئی ہیں مثلاً مسیح کی تقریروں کے ساتھ وابستہ ہیں جو تازگی اور جدت اور خوبصورتی سے مملو ہیں۔ اور اُن کو پڑھکر ہمارے دل پر عظمت اور حکمت اور فضل الٰہی کا وہی اثر پیدا ہوتا ہے جو باقی ماندہ بیان کی تلاوت سے ہوتا ہے۔ غرضیکہ وہ اس کامل بیان کا لاینفک جزو ہیں۔ جس کے مطالعہ سے الوہیت کا ایسا واضح اور ناقابل تردید پتہ ملتا ہے۔ جس سے پہلوتہی کرنا ناممکن ہے ٭

ہم کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں وہ بھی مسیح کی نسبت تین انجیلوں کی سب سے بڑی گواہی نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی کئی اور بڑی بڑی باتیں غور طلب باقی ہیں۔ مثلاً یہ انجیلیں بتاتی ہیں کہ جو مسیح مارا گیا تھا وہ پھر زندہ ہوا اس نے اپنے شاگردوں سے ملکر کہا کہ آسمان اور زمین کا سارا اختیار مجھکو دیا گیا ہے۔ اُس نے اُن کو بھیجا کہ اس کے نام سے قوموں کے درمیان توبہ اور گناہ کی معافی کی منادی کریں۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے "تم جاکر قوموں کو شاگرد

بناؤ اور اُنہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر (غور کیجئے "نام" واحد ہے۔ نہیں کہا "ناموں" پر۔ پس باپ بیٹا اور روح القدس ایک نام ہے) بپتسمہ دو" اور اُن کی تسلی اور ہمت کے لئے یہ عالیشان وعدہ عطا فرمایا۔ "دیکھو میں دنیا کے آخر تک ہر روز تمہارے ساتھ رہونگا (متی ۲۸: ۱۸-۲۰)

اس تثلیثی نام "باپ بیٹے اور روح القدس" کا مطلب بخوبی عیاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کی طرف ذرا توجہ کیجئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اس سے کوئی ایسا رشتہ مراد نہیں جو خدا اور انسان میں پایا جاتا ہو۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ ہم "باپ" کو "بیٹے" کا باپ اور "بیٹے" کو "باپ" کا بیٹا سمجھیں۔ پس اس سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ خدا دنیا سے ایک عام پدرانہ رشتہ رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کا تعلق مسیح سے وہی ہے جو باپ کا بیٹے سے ہوتا ہے۔ پس "بیٹا" جو کہ "باپ" اور "روح القدس" کے درمیان واقع ہے الوہیت کے حلقہ سے علاقہ رکھتا ہے اور اس امتیاز کو جو ذات الٰہی میں باعتبار تشخصات کے پایا جاتا ہے ظاہر کرتا ہے"۔ مگر یہاں پہنچ کر مخالف اس بیان کی معتبری پر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اس وقت تو مقابلہ یوحنا کی انجیل اور پہلی تین اناجیل کے درمیان کیا جاتا ہے۔ اور بیان مذکورہ بالا جو ثالوث پاک پر دلالت کرتا ہے۔ وہ پہلی تین اناجیل کا ہے۔ لہٰذا جو کچھ وہ انجیلیں بیان کرتی ہیں اس پر غور کرنا اس وقت ہمارا فرض ہے۔ علاوہ بریں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر مسیح کا کامل دعویٰ جس میں ساری باتیں آجاتی ہیں قبول کیا جائے تو ان ضمنی باتوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ اصول اختیار نہ کئے جائیں جو کہ اُس کی قیامت یعنی مردوں میں سے جی اُٹھنے کے مخالف ہوں۔ مگر یہ ایک ایسا پہلو ہے جو اُس کے کل دعوے کو پامال کرتا ہے +

CHRISTIAN STUDY CENTRE

تینوں انجیلوں میں جو تصویر مسیح کی پائی جاتی ہے وہ یہ ہے جو ہم نے

6230

پیش کی ہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ رسولی زمانہ میں مسیح کی ذات اور شخصیت کی نسبت جو عقیدہ پایا جاتا تھا اس سے نئے عہد نامہ کا بیان پوری پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اگر وہ زندگی جس کا بیان انجیلوں میں آتا ہے موجود ہو تو اس سے وہی عقاید پیدا ہونگے جو اس رسولی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ دوسری صورت میں اس کو اُلٹ کر یوں کہیں کہ اگر وہ عقیدہ جو مسیح کی شخصیت اور کام کی نسبت رسولی زمانہ میں متداول تھا موجود ہو تو اس سے انجیلی بیان کی تصدیق اور تائید ہوگی۔ کیونکہ اگر ایسی زندگی موجود نہ ہوتی۔ جیسی کہ انجیلوں میں بیان ہوئی ہے تو وہ عقیدہ جو رسولوں کے زمانہ میں مروج تھا کبھی خود بخود اختراع نہ کر سکتی۔ پس پہلی تین اناجیل میں ہم اسی ہستی کو دیکھتے ہیں جس کے بیانوں سے پولوس اور یوحنا کا کلام پُر ہے۔ اور جو محاورے اور اصطلاحیں وہ استعمال کرتے ہیں وہ وہی ہیں جو بہترین صورت میں اس کو ہم پر ظاہر کرتے ہیں۔ یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہیں کہ اگر پہلی تین انجیلوں کا مسیح موجود ہو تو اُس کی سیرت اور دعاوی کی شرح وہی ہوگی جو پولوس اور یوحنا پیش کرتے ہیں۔ پس ہم ڈارنر صاحب کے ذیل کے خیال سے پورا پورا اتفاق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ "بڑی دلیری اور صفائی سے یہ دعوے کیا جا سکتا ہے کہ مسیح کا جو بیان پہلی تین اناجیل میں پایا جاتا ہے وہ اس بیان کے جو یوحنا پیش کرتا ہے مشابہ ہے (یعنی وہ بھی اُسی مسیح کا بیان ہے جس کا ذکر پہلی تین انجیلیں کرتی ہیں) کیونکہ ضرور ہے کہ جو عقیدہ مسیح کی شخصیت اور کام کے متعلق پہلی تین انجیلوں کے بیان سے پیدا ہو۔ اس میں وہی رنگ نظر آئیں جو یوحنا کے بیان میں دکھائی دیتے ہیں"۔ اور پھر اس پر ڈارنر صاحب یہ فقرہ ایزاد کرتے ہیں۔ "جو لوگ یوحنا کی انجیل کو اس لئے رد کرتے ہیں کہ وہ مسیح کے جلال کو بڑھاتی ہے اُنہوں نے اس بیان پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی جو مسیح کی نسبت پہلی تین انجیلوں میں پایا جاتا ہے"۔

اب ہم یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم یہ ثابت کر چکے کہ اگر ہم مسیحی مذہب کے واقعات اور بیانات کا انصاف سے فیصلہ کرنا چاہیں تو ضرور ہے کہ ہم مسیح کی شخصیت کے الہی تصور کو قبول کریں اور اس بات کو مانیں کہ ازروے ہر سہ اناجیل مسیح الہی شخص تھا جو انسانی جامہ میں نمودار ہوا۔ اور جو دلیل ہم پیش کرتے آئے ہیں اُس سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ تجسم کی تعلیم مسیحی دین کی لازمی تعلیم ہے بلکہ اس سے بڑھکر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہم مسیحی مذہب کو ترک نہیں کر سکتے بشرطیکہ وہ دلیل جو ہم نے پیش کی ہے صحیح ہو۔ لیکن جو حقیقتیں ہم نے بیان کی ہیں وہ ایسی پرزور ہیں کہ ہم ملحدوں کے کہے سے دین عیسوی کو رد نہیں کر سکتے۔ اب وہ ہم سے یہ سوال پوچھ رہا ہے۔ "تم مسیح کی نسبت کیا کہتے ہو؟ وہ کس کا بیٹا ہے"؟ اس سوال کو نظر انداز کرنا دنیا کی طاقت سے بعید ہے۔ خواہ کتنے ہی عرصہ تک اس کی آواز خاموش رہے۔ آخرکار گونج اُٹھیگی۔ اور دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گونجتی رہے گی جب تک کہ تمام انسانیت عقیدت اور عابدانہ روح سے معمور ہوکر یہ نہ کہے "اے میرے خداوند۔ اے میرے خدا"!

یہانتک ہم نے مسیح کے تجسم کے واقعات پیش کئے ہیں۔ اب سوال برپا ہوتا ہے کہ ہم اس سے کیا سمجھیں؟ اس مضمون پر پورے پورے طور پر بحث کرنا ہماری تحقیق کے ساتھ علاقہ نہیں رکھتا۔ تاہم بعض باتوں کا بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اُن کی مدد سے ہمارے خیالات ان واقعات کو جو ہمارے سامنے پیش ہو چکے ہیں کبھی نظر انداز نہ کریں۔ اور اُن سے یہ بھی فایدہ ہوگا کہ زمانہ حال کی وہ تھیوریاں حد اعتدال سے بڑھنے نہیں پائیں گی جو مسیح کی شخصیت کے متعلق کلیسیا کے پرانے فیصلوں کی بجائے صحیح تعلیم دینے کا دعوے کرتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں یا تو اصل واقعات کے مطلب سے کم رہتی ہیں یا متجاوز ہو جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسیح کی شخصیت کی نسبت وہ پرانے فیصلے جو کلیسیا نے کئے ہیں نکتہ چینی کی گرفت سے بالکل

باہر نہیں ہیں۔ پس ممکن ہے کہ جس طرح اور تعلیموں کی نظر ثانی کی ضرورت ہے اسی طرح اس تعلیم کی نظر ثانی کی ضرورت بھی ہے۔ تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہم پُرانے فیصلوں اور تعریفوں کو ترک نہ کریں تاوقتیکہ اُن سے بہتر فیصلے اور تعریفیں وضع نہ کریں۔ اور وہ تعریفیں مسیحی مذہب کے واقعات کے مخالف بھی نہ ہوں۔ ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ زمانہ حال میں مسیح کی شخصیت کی نظر ثانی کے متعلق جو کوششیں کی گئی ہیں وہ اس شرط کو پورا نہیں کرتی ہیں۔ ہم یہاں چند ایک کا بیان کرینگے:۔

بہت سے عالمان علم الٰہی بربنائے شہادت کتب الہامی مسیح کو الوہیت منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے خیالات مسیح کی شخصیت کے متعلق نوشتوں کی کامل شہادت کے مطابق پورے انداز تک نہیں پہنچتے۔ شلائرمیخر اس قسم کے عالموں میں داخل ہیں۔ زمانہ جدید کے عالموں میں۔ رَوتے۔ بائسلیخ۔ رِتشل لپسی اس وغیرہ وہ اشخاص ہیں جو بڑی صفائی سے مسیح کی الوہیت اور انسانیت اور اس میں خدا کے مجسم ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن سوال برپا ہوتا ہے کہ اُن کا اس سے کیا مطلب ہے؟ ان تمام تصویروں کے مطابق مسیح کو ایک نہایت اعلیٰ اور عدیم المثل جگہ حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ دوسرا آدم بنی نوع انسان کا سرا اور ایسے معنی میں خدا کا بیٹا ہے کہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ وہ نمونہ کا مرد اور بے گناہ درمیانی اور بنی آدم کا نجات دہندہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اتنا ماننا بہت کچھ ماننا ہے۔ اور تجسم کی ہر تصویری میں خواہ وہ کوئی کیوں نہ ہو اتنا ماننا ہی پڑتا ہے۔ ماسوائے اس کے یہ تصویریاں یہ بھی تسلیم کرتی ہیں کہ مسیح میں خدا کا کشف پایا جاتا ہے۔ اور اسی اعتقاد کی بنا پر وہ مسیح کی طرف الوہیت اور الٰہی اور انسانی ذاتیں منسوب کرتی ہیں۔ اتنا تو یہ تصویریاں مانتی ہیں۔ مگر پھر بھی یہ سوال پیش آتا ہے کہ اس تجسم کی نیچر کیا ہے؟ یعنی خدا مسیح میں مجسم ہوا اور اس کے تجسم کا کیا مطلب ہے۔ شلائرمیخر کی رائے کے مطابق جیسا کہ ہم دوسرے لیکچر میں دیکھ آئے ہیں تجسم سے مراد خدا کی پہچان کی وہ طاقت ہے

جوہر انسان میں بالقواء موجود ہے۔ دیگر مسیح میں اس طاقت نے خاص طور پر خدا کی حضوری کو پہچانا) روٹے کے مطابق اس سے مراد خدا اور انسان کا اخلاقی میل ہے جو مسیح کی بے گناہ زندگی کی ترقی میں بتدریج واقع ہوا اور جب میل کامل ہوگیا تو خدا کا انسان میں رہنا کامل طور پر وجود پذیر ہوا۔ یعنی الہیت اور انسانیت کا کامل میل ہوگیا۔ باڈشلیخ کے مطابق اس سے مراد اس کامل اور ازلی رشتہ فرزندی کی پہچان ہے جو انسان خدا سے رکھتا ہے۔ اور جس کی اصل اس غیر شخصی اصول میں پائی جاتی ہے۔ جو خدائیت میں ازل ہی سے موجود ہے۔ اور رٹشل کے نزدیک مسیح کی خدائیت محض ایک اخلاقی اور مذہبی مطلب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ مسیح میں جو کہ خدا کا سب سے اعلیٰ مظہر اور خدا کی بادشاہت کا بانی ہے۔ انسانی مرضی کی یگانگت خدا کی مرضی کے ساتھ دنیا کی نجات کے مقصد کے متعلق پائی جاتی ہے۔ اور کہ اسی میں خدا کی صفات مثل فضل اور سچائی اور حکومت کے پورے پورے طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ لپیسی اس کے نزدیک تجسم اور الوہیت سے یہ مراد ہے کہ مسیح نے خدا کی فرزندی کے اس کامل رشتے کو پہچانا جو انسانیت کے اصل تصور کا سب سے اعلیٰ عنصر ہے۔ ان تھیوریوں کا مطلب آگے چل کر خوب کھل جائیگا +

اب ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ ان تھیوریوں میں ہم ضرور ایک قسم کا میل مابین الٰہی اور انسانی ذات کے پاتے ہیں۔ یعنی ایسا میل جیسا کہ مسیح کے ایماندار اس وقت حاصل کرتے ہیں جبکہ وہ بسبب مسیح کے ساتھ میل پانے اور اس کی روح کی نعمتوں میں شامل ہونے کے خدا کے فرزند اور اس کی الٰہی طبیعت کے حصہ دار ہو جاتے ہیں۔ علاوہ بریں ہم اس بات کا بھی انکار نہیں کرتے کہ یہ تھیوریاں مسیح کو اور بنی آدم پر امتیاز بخشتی ہیں۔ کیونکہ وہ اس کو الٰہی فرزندی کا وہ نمونہ قرار دیتی ہیں جس کے وسیلے سے اور لوگ اس فرزندی میں داخل ہوتے ہیں۔ اور شاید کوئی یہ بھی کہے کہ اگر اس طرح سے انسانیت معمور بہ الوہیت ہو جائے یعنی اخلاقی طور پر

انسانیت کے اندر الوہیت کا کمال مجسم ہو جائے تو کیا اس سے وہی عملی فواید برآمد نہ ہوں گے جو تجسم کی کسی اور تعلیم سے برآمد ہو سکتے ہیں؟ لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ ہمیں خبردار رہنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم سب سے اعلیٰ تصور کو ترک کر دینگے تو جیسا ہم اوپر دکھا آئے ہیں یہ نتیجہ ہوگا کہ ہم کسی طرح کی الوہیت نہیں مانیں گے بلکہ خالص انسانیت پر آجائیں گے +

دو باتیں نہایت غور طلب ہیں (۱) آیا یہ تصویریاں بذات خود واجب التسلیم ہیں؟ (۲) کیا یہ تصویریاں مسیح کے مکاشفہ کے واقعات اور نئے عہدنامہ کے مسلمہ بیانوں سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہیں۔ پہلے ہم انہیں دو باتوں کی نسبت کچھ بیان کریں گے اور پھر اُن خیالات پر بھی چند الفاظ تحریر کریں گے "جو کیناٹک" (Kenotic) کہلاتے ہیں۔ یعنی اس مسئلے سے علاقہ رکھتے ہیں کہ مسیح نے اپنے آپ کو خالی کر دیا (فلپی ۲ : ۷)

(۱) جن تصویریوں (یعنی خیالوں) کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم کے تو وہ خیالات ہیں جو مسیح سے الوہیت منسوب کرنے کی وجہ قبل از تجسم تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی مانتے ہیں کہ جسم میں ظاہر ہونے سے پیشتر ہی وہ وجہ موجود تھی جس کے سبب سے وہ انتساب الوہیت کا مستحق ہے۔ اور دوسری قسم کی تصویریاں وہ ہیں جو اس وجہ کی تقدیم کے مقر نہیں ہیں۔ اُن کے نزدیک انتساب الوہیت کی وجہ بعد از تجسم مانی جاتی ہے

(۱) دوسری قسم کی تصویریاں وہ ہیں جو شلائر میخر اور رٹشل اور ایسی اس کی ہیں۔ ہم یہاں ان تصویریوں کی دیگر خصایص پر نقادانہ نظر نہیں ڈالینگے لہذا محض ان وجوہات پر غور کریں گے۔ جن کی بنا پر وہ مسیح سے الوہیت منسوب کرتی ہیں۔ ہمیں ان تصویریوں میں کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جو انسانیت کی حدود سے بلند و بالا ہو۔ مسیح اصل انسان۔ نمونہ کے لایق انسان بیگناہ انسان فضل اور سچائی کا کامل مکاشفہ۔ بنی نوع انسان کا مرجع۔ سچے مذہب کے اصول کو ظاہر کرنے والا۔ انسانیت میں خدا کی بادشاہی کا قایم کرنے والا۔

باپ کی محبت کا محبوب۔ یہ سب کچھ ان تصویریوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ تاہم ان میں مسیح انسان سے سرمو زیادہ نہیں ہے۔ یہ مانا کہ اس کی انسانیت خدا سے معمور ہے۔ لیکن خدا سے معمور انسانیت اور بات ہے اور خدا کا انسان بننا اور بات ہے۔ ممکن ہے کہ انسان خدا کی زندگی میں شریک ہو۔ بلکہ یہ کہو کہ اُس کی طبیعت سے بھی بہرہ ور ہو۔ لیکن وہ شخص جس میں اس طرح خدا رہتا ہے اپنے آپ کو کبھی الٰہی شخص نہیں کہے گا۔ اور نہ اپنے آپ کو الٰہی تعظیم کا مستحق سمجھے گا۔ بلکہ الوہیت کے انتساب کو بڑے درجہ کا کفر جانے گا۔ پس اگر ہم مسیح کی شخصیت کی نسبت فقط اُتنا ہی مانیں۔ جتنا یہ تصویریاں مانتی ہیں تو ہم الوہیت اس کو منسوب نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ مان سکتے ہیں کہ خدا اس میں تھا مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود الٰہی شخص تھا۔ ہم اس کو الٰہی مکاشفہ کا آلہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ تاہم ہمیں کشف کرنے والا خدا اور اُس انسانیت میں جس کے وسیلے سے کشف الٰہی ظہور پذیر ہوا امتیاز کرنا ہوگا۔ اس حالت میں بھی یعنی اس کو ذات الٰہی ماننے کی حالت میں بھی اس کو خدا کہنا کفر کا باعث ہوگا۔ اور اس کو الٰہی عزت دینا بت پرستی ہوگا۔ اسی لئے رٹشل کو اقرار کرنا پڑا کہ کلیسیا محض مجازی طور پر مسیح کو الوہیت منسوب کر سکتی ہے۔ اور کہ اس کو الٰہی کہنا قیاسی ضرورت پر قایم نہیں ہے بلکہ اس وقعت پر قایم ہے۔ جو وہ ایماندار کے لئے رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ کلیسیا مسیح کو خدا اس لئے کہتی ہے کہ وہ اس کے لئے سب کچھ ہے۔ ورنہ حقیقت میں وہ خدا نہیں ہے۔ اور اسی طرح شلائر میخر اور رٹشل دونوں مسیح کو اس کے صعود کے جلال اور پھر آنے اور عدالت کرنے کی حقیقتوں سے عریاں کر دیتے ہیں یعنی ان صداقتوں کو استعارے سمجھتے اور استعاروں کی طرح اُن سے سلوک کرتے ہیں پس اُنکے نزدیک مسیح صرف روحانی طور پر اپنی کلیسیا کے درمیان حاضر ہے۔ اس کی روحانی صورت اُن کے درمیان موجود۔ اس کی تعلیم اُن کے پاس ہے۔ اور اس کا اثر ایمانداروں کے بیچ تازہ ہے۔ یہی اعتقاد اس تصور سے پیدا ہوتا ہے جو مسیح کو انسانی حدود

ہیں محدود رکھتا اور اس میں انسان سے بڑھکر اور کچھ نہیں دیکھتا ہے۔ کیونکہ اگر مسیح ایسا ہے جیسا کہ انجیل میں بعد از قیامت نظر آتا ہے تو پھر اُسے انسان سے بالاتر نہ جاننا مشکل ہے۔ پس یہ روش کہ جو باتیں اپنے دل کو اچھی نہ لگیں اُن کو رد کر دیں قابل برداشت نہیں ہے۔ علاوہ بریں خداوند یسوع کے بہت سے کلمات ایسے موجود ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کا رشتہ باپ سے ایسا تھا جیسا کہ انسانوں میں اور کوئی انسان نہیں رکھتا۔ اب ہم ان تصوریوں سے آپ کی عنان توجہ کو دوسری قسم کے خیالات کی طرف پھیرتے ہیں جو مسیح کی شخصیت کی وجہ زمین کو چھوڑ کر اعلیٰ کرہ میں دیکھتے ہیں ÷

(۲) ان کی مثال ہم روٹے اور بانسلخ وغیرہ صاحبان کے خیالات کو سمجھیں۔ روٹے صاحب کے نزدیک مسیح کی الوہیت کی وجہ اس قیاس میں پائی جاتی ہے کہ مسیح جوں جوں اپنی بے گناہ زندگی کے مدارج میں ترقی کرتا گیا تیوں تیوں خدا بھی اُس کے ساتھ ملتا گیا حتیٰ کہ وہ درجہ آ گیا جب خدا ذات اور شخصیت دونوں کے اعتبار سے اس کے ساتھ مل گیا۔ بائسلخ صاحب یہ کہتے ہیں کہ شروع میں ایک الٰہی غیر شخصی اصول موجود تھا اور اُسے وہ انسانیت کا ازلی کامل اندازہ سمجھتے ہیں۔ یہ ازلی کامل انسانیت جو شروع میں بے تشخص تھی مسیح میں مجسم ہوئی۔ اب قطع نظر اس کے کہ ان دونوں خیالوں کا ثبوت کلام میں نہیں پایا جاتا کہ یہ خیالات طرح طرح کی عقلی مشکلات کے نیچے میں گرفتار ہیں۔ کیا کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ بہ اعتبار سادگی اور عام فہم ہونے کے یہ خیالات پُرانے عقیدہ پر فضیلت رکھتے ہیں؟ اب روٹے کی تھیوری لیں۔ ہم اُن کے اس خیال سے کیا کریں کہ ایک شخصیت ہے جو شروع میں انسانی ہے مگر رفتہ رفتہ الٰہی بن جاتی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ دو شخصوں کے ایک بن جانے کا (اور وہ بھی اخلاقی عمل سے) کیا مطلب ہے؟ کیونکہ خدا ایک جدا شخص ہے اور مسیح ایک جدا شخص مگر یہ دونوں جدا جدا اشخاص

بقول روٹے آخر کار ملکر ایک بن جاتے ہیں۔ اس سے تو محض ایک اخلاقی یگانگت یا اخلاقی دوستی سمجھ میں آتی ہے اور بس کیونکہ دونوں شخص جدا جدا رہتے ہیں۔ اور یگانگت محض مرضی اور محبت میں پیدا ہوتی ہے۔ پر اُن کی یگانگت محض اسی قسم کی ہے تو ہم مسیح کو غلطی سے خدا کہتے ہیں۔ علاوہ بریں ہم پوچھتے ہیں کہ اس نئی یگانگت میں خدا باپ اور مسیح بیٹا کس طرح ہوا؟ کیونکہ روٹے صاحب ذات ربی میں امتیاز تشخصات کے قایل نہیں ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق باپ ہی اپنے آپ کو خدا کے ساتھ ملاتا اور اپنی الوہیت اُس کو دیتا ہے۔ چنانچہ وہ صاف صاف طور پر لکھتے ہیں۔ کہ "خدا کا تجسم دوسرے آدم میں دو نو طرح کا ہے۔ یعنی شخصیت کا بھی اور ذات کا بھی" لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اگر وہی ایک شخصیت جسے ہم خدا کہتے ہیں مسیح کی الوہیت کے ساتھ مل جاتی ہے تو پھر باپ اور بیٹے کا امتیاز کیونکر قایم رہا۔ اور اگر نئی شخصیت پیدا ہوگئی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تجسم کے وقت سے ایک اور شخصیت الٰہی شخصیت پر اضافہ کی گئی۔ یہ خیال تناقضات سے بھرا ہوا ہے۔ بائسلخ کے خیال پر بہت دیر تک ٹھیرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس بات کا قایل ہے۔ کہ شروع ہی سے ایک غیر شخصی انسانیت موجود تھی۔ اس میں بھی بے شمار دقتیں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس غیر شخصی انسانیت کا ازلی تصور اور ازلی تصورات کی نسبت جو وقت کے دور میں پورے ہوئے کیونکر زیادہ الٰہی ہو سکتا ہے؟ دینداروں کا تصور۔ کلیسیا کا تصور۔ دنیا کا تصور۔ یہ سب تصورات ازل میں موجود تھے۔ یہ کیوں ازلی انسانیت کے تصور سے کم الٰہی سمجھے جائیں؟ علاوہ بریں ہم جاننا چاہتے ہیں کہ یہ ازلی نمونہ کے لایق انسانیت کیا ہے؟ کیا اس سے صرف مسیح ہی کی انسانیت مراد ہے یا تمام بنی آدم کی؟ اور پھر ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ یہ ازلی انسانیت جس کے سبب سے وہ فوق العادت شخص بنا اس انسانیت سے جو اس کو داؤد کی نسل میں ہونے سے حاصل ہوئی یعنی اس انسانیت سے جو خون اور گوشت کی انسانیت ہے کیا

علاقہ رکھتی ہے۔؟ اور پھر یہ سوال بھی جواب طلب ہے کہ اگر یسوع باعتبار انسانیت کے ایسا عجیب شخص تھا۔ یعنی ایسی عجیب انسانیت رکھتا تھا تو وہ سب باتوں میں اپنے بھائیوں کے مانند کس طرح بنا؟ اس قسم کے سوالات پر بحث کرنا تضیع اوقات کرنا ہے تاہم روٹے اور بائسلیخ جیسے اشخاص کے خیالات سے فایدہ ضرور پہنچا ہے اور وہ یہ کہ اُن کے نقصوں سے معلوم ہو گیا کہ صحیح خیال کیا ہے اور اُسے کہاں تلاش کرنا چاہیے۔

(۲) دوسرا سوال جو ہم پیش کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ کیا یہ تصویریاں خداوند مسیح کے اظہار کے تمام واقعات سے مطابقت اور نئے عہد نامہ کے امور مسلمہ سے موافقت رکھتی ہیں؟ جواب ہے کہ نہیں۔ کیونکہ پاک نوشتوں میں نہ روٹے کے بتدریج تجسم کی اور نہ بائسلیخ کے ازلی انسانی اصول کی تائید میں کوئی نوشتہ پایا جاتا ہے۔ برعکس اس کے بے شمار ایسے مقامات پائے جاتے ہیں جو بداہتاً اور دلالتاً مسیح کی ازلی شخصیت پر شہادت دے رہے ہیں۔ اور اس ازلی حالت میں اس کی طرف الہٰی اعمال اور کام منسوب کر رہے ہیں قطع نظر اس کے وہ تمام مقامات جو مسیح کی عجیب الہٰی فرزندی کے رشتہ پر گواہی دیتے ہیں اور نیز وہ مقامات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود اس بات کو پہچانتا تھا کہ مجھ میں ایسے اوصاف اور قواء پائے جاتے ہیں جو انسانی دائرہ سے بلند ہیں اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ آسمانی شخص تھا اور تجسم سے پہلے یعنی ازل سے موجود تھا۔ اب سوال برپا ہوتا ہے کہ تجسم کی اصل اور صحیح تعلیم کیا ہے؟ تجسم سے مراد اعلیٰ سے اعلیٰ عطیوں یا فضائل کا حاصل ہونا نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی خاص قسم کی طاقت مسیح کے اندر کام کرتی تھی۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ جو یگانگت اللہ اور انسان میں ہمیشہ سے موجود تھی۔ اس کی شناخت مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور نہ اس سے وہ اخلاقی یگانگت مراد ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسانی مرضی اور سیرت سے مل گئیں۔ اور نہ اس سے غیر قوموں کے دیوتاؤں اور اُن کے

فرزندوں کا سا رشتہ مراد ہے کیونکہ وہ رشتہ جسمانی ولدیت پر دلالت کرتا تھا۔ نہ اس سے خدا کا تھوڑی دیر کے لئے انسانی صورت میں نمودار ہونا مراد ہے جیسا کہ وشنوں کے اوتاروں سے ذہن میں آتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک الٰہی شخص انسانیت میں داخل ہوا یا یوں کہو کہ اس الٰہی شخص نے انسانیت کو اپنی شخصیت میں لے لیا۔ ہم مانتے ہیں کہ اس رشتہ میں جو ایماندار خدا سے رکھتا ہے اور اُس رشتہ میں جو مسیح باپ سے رکھتا ہے۔ ایک قسم کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور اس کی طرف اشارہ خود مسیح کے الفاظ میں پایا جاتا ہے یوحنا ۱۷: ۲۱۔ لیکن اس مقام میں جو یگانگت مقصود ہے وہ اخلاقی ہے نہ کہ ذاتی جیسی کہ یوحنا ۱: ۱ سے مترشح ہے۔ اور فرق یہ ہے کہ ہماری شخصیتیں انسانی ہیں اور ان میں خدا کا نور اور محبت اور علم خواہ کسی درجہ تک کیوں نہ ہو تو بھی وہ انسانی ہی رہتی ہیں۔ لیکن مسیح کی شخصیت الٰہی شخصیت تھی۔ جس نے انسانیت کی حالتوں اور عوارض کو اپنے اوپر لے لیا وہ ازل سے انسانی شخصیت نہ تھی بلکہ الٰہی۔ ہم مانتے ہیں کہ اس تعلیم کے متعلق بڑی مشکلات سامنے آتی ہیں اور شاید بعض ایسی بھی ہیں جن کا جواب انسان کی محدود عقل دے نہیں سکتی۔ تاہم یہ تعلیم کلام کی ہے اور تجسم کے مسیحی مسئلہ کی جان :-

(۳) قبل ازایں کہ ہم اس مضمون پر اور کچھ تحریر کریں یہ ضروری امر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس جگہ اُس مسئلہ پر تھوڑی دیر کے لئے غور کریں جو کینوسس (Kenosis) کا مسئلہ کہلاتا ہے۔ یہ لفظ فلپیوں کے دوسرے باب کی ساتویں آیت سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی خالی کرنے کے ہیں۔ اس مقام میں رسول مسیح کی نسبت کہتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خالی کر دیا اور غلام کی صورت اختیار کی۔ سوال ہے۔ کہ اس خالی کرنے سے کیا مراد ہے؟ کیا مسیح نے الٰہی ذات کو بالکل چھوڑ کر انسانی ذات کو اختیار کیا۔ اور اگر اُس نے الوہیت کو لفظی طور پر نہیں چھوڑا تو پھر اس جملہ کا کیا مطلب ہے۔ جرمن کے بعض بعض علما نے اور نیز فرانس کے علماء

ہیں سے گوڈٹے صاحب کا خیال ہے کہ اُس نے واقعی الٰہی ذات سے اپنے آپکو کچھ عرصہ کے لئے خالی کر دیا۔ یعنی الٰہی صفات کو اُتار کر بالائے طاق رکھا اور محدود انسانیت کے دائرہ میں بغیر اس شناخت کے کہ میں ایک الٰہی شخص ہوں داخل ہوا۔ واضح ہو کہ اس قسم کے خیالات اس لئے پیدا ہوئے۔ کہ مسیح کی انسانیت میں کسی طرح کا فرق نہ آئے۔ کیونکہ ان خیالات کے موجدوں کو ڈر تھا۔ کہ کہیں پرانے عقیدہ سے مسیح کی انسانیت کا انکار لازم نہ آئے۔ ان لوگوں کے خیالات کو بہت اشخاص نے قبول کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا عین بجا ہے کہ یہ خیالات اس قسم کے ہیں کہ کلیسیا اُن کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ اگر کلیسیا ان کو مان لے تو اُسے گویا یہ ماننا پڑا کہ تین الٰہی اقانیم میں سے ایک نے الٰہی ادراک کو ترک کر دیا اور الٰہی کاموں کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ نوشتے ہم کو بتلا رہے ہیں کہ بیٹے نے تمام اشیا کو پیدا کیا ہے اور وہی اُن کو سنبھالتا اور اپنی قدرت کے کلام سے قایم رکھتا ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کا تعلق موجودات سے ایسا لازمی ہے۔ کہ اس کی الٰہی قدرت نظام خلقت کے سنبھالنے کے لئے ہر وقت کام کرتی رہتی ہے۔ لیکن خالی کرنے کی وہ تفسیر جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا یہ ظاہر کرتی ہے کہ مسیح کا تعلق موجودات سے لازمی نہیں ہے۔ پس ہم اُس شرح کو قبول نہیں کر سکتے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس شرح کو قبول کرنا تجسم کے مسئلہ کے لئے ضروری نہیں ہے۔ ہم نیچر میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ خدا اس میں موجود ہے تاہم اس سے بلند اور بالا ہے۔ اس خیال کو انگریزی زبان کے دو الفاظ بہت اچھی طرح ادا کرتے ہیں اور وہ ایمننٹ (Immanent) اور ٹرنسنڈنٹ (Transcendent) ہیں۔ خدا اپنی خلقت میں حاضر و ناظر بھی ہے اور ساتھ ہی اس قدر اس سے بلند و بالا ہے کہ خلقت وہاں پہنچ نہیں سکتی۔ اس طرح خدا کا بیٹا انسانی زندگی کی محدودیت اور تقیدات میں داخل ہوا۔ لیکن اس کا یہ ادراک کہ میں ایک الٰہی شخص ہوں۔ انسانی زندگی سے بالا اور برتر تھا۔ علم سائیکالوجی نے بھی ہم پر اس بات کو ظاہر کر دیا ہے کہ ایک ہی شخصی زندگی میں

CamScanner

اور بہتر ہے کہ ہم اس بات کو کبھی نظر انداز نہ کریں۔ پس رسول کا جو مطلب "خالی کرنے" سے ہے وہ صرف اتنا ہے کہ "مسیح آدمیوں میں بے نہایت ذلیل اور حقیر تھا۔ وہ مرد غمناک اور رنج کا آشنا ہوا" یسعیاہ ۵۳: ۳ ؛

واضح ہو کہ ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا اس سے ظاہر ہو گیا ہے کہ قدیم کلیسیا نے بڑی دانائی اور سچائی سے عقاید عیسوی کو غلطی سے محفوظ رکھا۔ اب اس سے یہ مراد نہیں کہ زمانہ حال میں علما نے جو کچھ لکھا ہے۔ یا انھوں نے جو محنت اور وقت تحقیقات میں صرف کیا ہے وہ رائگاں گیا۔ نہیں۔ ان کی تحقیقات سے بڑا فایدہ پہنچا ہے۔ چنانچہ یہ جدید غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ انسانیت اور الوہیت کو لوگ اب ایک دوسرے کے بہت ہی قریں تصور کرتے ہیں۔ البتہ وہ دو تو ایک ہی نہیں ہیں۔ تاہم ان میں ایک طرح کی مشارکت پائی جاتی ہے جس کی تصدیق نوشتے اس طرح کرتے۔ "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا" نیز جدید تحقیقات اس خیال کی موید ہے کہ انسانیت الوہیت کو قبول کر سکتی ہے۔ ماسوائے اس کے اور طرح طرح کے فوائد اس مسئلہ کے حل کرنے میں اُن محققوں سے پہنچتے ہیں جو شلائر میخر سے لے کر آج تک اس مضمون پر لکھتے آئے ہیں۔ شاید یہ خیال اچھی طرح واضح ہو جائے گا اگر ہم اس اعتراض کو پیش کر دیں جو تجسم کے نام عقیدے پر جو کہ نوشتوں پر مبنی ہے کیا جاتا ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ اگر ہم مانیں کہ ایک آسمانی اور الٰہی شخص نے انسانی ذات کو اختیار کیا تو اس سے اُس انسانی ذات کی جو مسیح میں موجود تھی حقیقت یا کم از کم اصلیت دور ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت کو یوں بیان کر سکتے ہیں۔ کیا مسیح کی انسانیت اپنی علیحدہ شخصیت رکھتی تھی یا اس میں صرف الٰہی شخصیت ہی تھی؟ نسطوری بدعت سے بچنے اور مسیح میں دو شخصیتوں کے قرار دینے کے عیب سے محفوظ رہنے کی خاطر کلیسیا نے انسانی ذات کے تشخص کے عدم کو تسلیم کیا اور یہ بات مسیح کی ذات و صفات کے اس تصور سے جو صداقت لاگاس (کلمہ) پر مبنی ہے عقلاً پورے پورے طور پر مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن

زمانہ جدید کے علماء نے اسی بات کو اپنے اعتراض کی اساس بنایا جب یہ حجت کی کہ اس عقیدے سے مسیح کی الوہیت تو قایم ہوتی ہے۔ مگر اس کی انسانیت کی حقیقت چکنا چور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ (۱) اگر مسیح کی انسانیت اپنی علیحدہ شخصیت نہیں رکھتی تھی تو کیا اس کی انسانی ذات ادھوری نہ رہی (۲) اگر اس کی الہی شخصیت ہی ایگو (Ego) یعنی "میں" کہنے والی تھی تو کیا اس سے اس کی انسانیت سچائی میں فرق نہیں آتا؟ اسی واسطے بعضوں نے کہا ہے کہ مسیح میں نہ صرف انسانی اور الہی ذاتیں ہی باہم ملیں بلکہ انسانی اور الہی شخصیتیں بھی ملیں۔ اب ذرا غور سے دیکھیں کہ یہ مشکل کیا ہے اور کس طرح رفع ہو سکتی ہے؟

ساتواں باب

ذات الہی کی نسبت وہ اعلیٰ تصور جو تجسم کے مسئلہ سے صادر ہوتا ہے

تجسم اور دنیا کی تجویز

پچھلے باب کے آخر میں ہم نے جس بات کو ثابت کیا وہ یہ تھی کہ مسیح کے مکاشفہ سے جو صداقتیں ظاہر ہوتی ہیں وہ اس کی شخصیت کے کسی ادنےٰ تصور کی تائید نہیں کرتی ہیں۔ وہ اس تصور کی موید ہیں جو رسولوں کی تصانیف سے مترشح ہوتا ہے۔ اس خیال کی مزید تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ مسایل دین عیسوی کی تاریخ میں بجز رسولی تصور کے اور کوئی تصور قایم نہیں رہا +

پس وہ خیالات جو الوہیت کو مسیح سے محض مجازی طور پر منسوب کرتے ہیں اور اسی طرح وہ خیالات جو اس کی الوہیت کے تو قایل ہیں مگر اسکی ازلیت

کے منکر ہیں کلام کی شہادت سے تطبیق نہیں رکھتے - پہلی قسم کے خیالات بالآخر محض انسانیت ماننے لگ جاتے ہیں - اور دوسری قسم کے خیالات کے سامنے یہ دقت پیش آتی ہے - کہ انہیں ایک نیا الہٰی شخص الوہیت کے دائرہ میں داخل کرنا پڑتا ہے - واضح ہو کہ اس وقت کو یہ خیال بھی دور نہیں کرتا کہ خدا اخلاقی معنوں میں مسیح کے اندر موجود تھا - اس میں شک نہیں کہ جس طرح خدا اپنی روح کے وسیلے اپنے ایمانداروں کے باطن میں موجود ہوتا ہے اسی طرح وہ مسیح میں بھی موجود تھا - تاہم کسی ایماندار کو سجدہ کرنا ہمارے نزدیک واجب نہیں خواہ اللہ تعالیٰ اس میں کیسی ہی بھرپوری کے ساتھ موجود کیوں نہ ہو - ہم اس خدا کی جو اس میں ظاہر ہوتا ہے عبادت کرتے ہیں مگر اُس ایماندار کو اپنا معبود نہیں مانتے - پس وہ عبادت جو شروع ہی سے کلیسیا مسیح خداوند کو دیتی رہی ہے اس الوہیت میں جو وہ رکھتا تھا اور اس الہٰی حضوری میں جو ایماندار کو حاصل ہوتی ہے ایک نمایاں حد فاصل کھینچتی ہے -

اب ہم اس ذات الہٰی کے اس اعلیٰ تصور پر غور کریں گے جو تجسم کی صداقت سے صادر ہوتا ہے - یعنی اس تصور پر جو اصطلاح میں ثالوث یا تثلیث کے نام سے مشہور ہے - مسیحی مذہب کے اصول کے مطابق تجسم اور روح القدس کے مسایل سے جو باتیں متعلق اس تعلیم کے ذہن میں آتی ہیں ان میں پہلی بات یہی ہے - اگر کوئی اس بات پر دھیان سے غور کرے تو اُسے لکھنا پڑیگا کہ ہم تجسم کے مسئلے کو مان ہی نہیں سکتے جب تک کہ اس عام تصور میں جو ذات باری کی نسبت رکھتے ہیں کچھ نہ کچھ تغیر نہ آئے - گویا مجبور ہو جاتے ہیں کہ خدا کے تصور کو از سرنو ایسے طور پر قایم کریں کہ وہ خدا کے اعلیٰ کشف کے ساتھ جو ہم کو دیا گیا ہے پوری پوری مطابقت رکھے - اسی طرح کے غور و فکر سے وہ تصور پیدا ہوا اور ہوتا ہے جو علم الہیات میں باپ - بیٹے اور روح القدس - ایک خدا - یعنی تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کے نام سے موسوم ہے - یہ تعلیم اسی طرح مسیحی مذہب کا ایک بنیادی پتھر ہے

جس طرح تجسم کی تعلیم اس کی ایک اعلیٰ اور لازمی تعلیم ہے ✣

شروع میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اس تعلیم کو یہ کہکر ترک نہیں کر دینا چاہئے کہ اس تعلیم کو پیش کرنا ہمارے اعتقاد اور ایمان پر بے فایدہ بوجھ ڈالنا ہے یعنی یہ نہیں خیال کرنا چاہئے کہ یہ تعلیم خلاف عقل ہے یا موجودات کی حقیقت کے سمجھنے میں اس سے کچھ روشنی نہیں ملتی۔ یا اس کا کوئی عملی علاقہ ہماری سچی زندگی کے ساتھ نہیں ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تعلیم انسان کے سوچ و فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ کسی شخص نے اس کو بیٹھ کر نہیں گھڑا۔ یہ وہ تعلیم ہے جو خدا کے اس کشف سے جو اس نے اپنی ذات و صفات کے متعلق آپ عطا فرمایا ہے خود بخود اصول استقراء کے مطابق منتج ہوتی ہے۔ جس طرح اہل سائینس حقایق فطری پر غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مقناطیسی سوئی ہمیشہ قطب کی طرف مایل ہوتی ہے اسی طرح انکشافات ذات الہی پر غور کرنے سے علمائے علم الہی اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ثالوث کی تعلیم برحق ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ تعلیم ایسی تعلیم ہے کہ کلیسیا اس کو جان لینے کے بعد کبھی ترک نہیں کر سکتی۔ فلسفانہ پہلو سے بھی اگر اس پر غور کیا جائے تو اس کی عظمت اور منزلت منکشف ہو جائیں گی۔ جسقدر ہم خدا کی ہستی کے اسرار پر زیادہ غور کرتے ہیں اسی قدر ہم زیادہ اس بات کے قایل ہوتے جاتے ہیں کہ خدا کو ایک قیاسی اور امتیازات سے خالی وحدت ماننا ناممکن ہے۔ لہذا اس بات کو ماننا پڑتا ہے کہ خدا کی حیات اور محبت اور شخصیت بلکہ ابوت کے لئے مسئلہ ثالوث کو قبول کرنا ایک ضروری امر ہے۔ پروفیسر فلنٹ صاحب خوب فرماتے ہیں کہ وہ ثالوث مقدس کی تعلیم ہے تو ایک راز مگر ہے ایسا راز جس سے کئی اور رازوں کے عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سے خدا کی ذات اور سلسلہ نیچر (فطرت) اور انسان پر بڑی روشنی گرتی ہے"۔ پروفیسر لیڈ لا صاحب یوں فرماتے ہیں

"کشف الہی کے اظہاروں میں یہ تعلیم ایسی ہے کہ اس کا اثر دور دور تک پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کو پورے پورے طور سے قبول کر لینے سے ہمارا علم الہی اور ہماری عملی دینداری بہت موثر ہوتی ہے۔ یہی تعلیم ہستیٔ خدا کا کمال ہے اور یہی اس کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔" مارٹنسن صاحب کا قول ہے۔ "اگر مسیحی تعلیمات کے درمیان یہ تعلیم نہ ہوتی تو علم اخلاق کو خود اپنے فایدے کے لئے اس تعلیم کو تیار کرنا پڑتا۔" علماء کے ایسے ایسے بے شمار اقوال اقتباس کئے جا سکتے ہیں :-

جیسا ہم اوپر عرض کر آئے ہیں اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تعلیم واہمہ کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ علمائے علم الہی نے اس کو خود اپنے خیال سے ایجاد کیا ہے۔ اور نہ ہی یہ یونانی فلسفہ سے مسیحی علم الہی میں داخل کی گئی ہے۔ یہ تو مسیحی مکاشفہ کی صداقتوں سے اصول استقراء کے مطابق مستنبط ہوتی ہے۔ ہم اس شخصی امتیاز کو جو خدائی ذات میں پایا جاتا ہے خود بخود دریافت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اس نے خود اپنے مکاشفہ کے وسیلے ہم پر ظاہر فرمایا ہے۔ جس طرح ہم اپنی عقل۔ حافظے۔ واہمے اور ارادہ سے بذریعہ ان کے اظہارات کے واقف ہوتے ہیں یا جس طرح ہم نیچر کی طاقت کی مختلف صورتوں کو جو روشنی گرمی بجلی اور کشش کیمیائی میں نمودار ہوتی ہیں ان کے کاموں کے ذریعہ جان لیتے ہیں اسی طرح ہم خدا کی ذات کی حقیقتوں کو ان کے کشف و اظہار سے دریافت کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارا اعتقاد متعلق ثالوث مقدس کے اُن آیتوں پر مبنی نہیں ہے جو کلام میں سے نکال کر ثبوت کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ بے شک یہ آئتیں اپنی جگہ پر بہت مفید ہیں۔ وہ گویا اس صداقت کو جو نئے عہد نامہ کے مکاشفہ کی حقیقتوں سے صادر ہوتی ہے پیش کرتی اور ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ ذات الہی کے متعلق جو تاویل یا شرح ہم کرتے ہیں وہ صحیح ہے۔ تاہم ہمارا عقیدہ ان آیتوں پر قایم نہیں ہے۔ وہ اُن

حقیقتوں پر قایم ہے جو بوسیلہ کشف ہم پر ظاہر ہوئی ہیں۔ ثالوث مقدس کا تصور اس وقت بالکل صحیح اور واجب معلوم ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے جو مکاشفہ اپنی ذات پاک کے متعلق عطا فرمایا ہے اس کی تہ میں اور نیز اس نجات کی تہ میں بھی جس کے متعلق تین الہی اشخاص کام کرتے ظاہر ہوتے ہیں یہی تصور پایا جاتا ہے۔

اب چونکہ ثالوث مقدس کی تعلیم محض نئے عہد نامہ کے کمل مکاشفہ کی حقیقتوں سے صادر ہوتی ہے اس لئے پرانے عہد نامہ میں اس تعلیم کو اس کمل صورت میں تلاش کرنا درست نہیں ہے۔ تاہم یہ خیال ہمارے دلوں میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تعلیم درست ہے تو اس کی کچھ نہ کچھ خبر پُرانے عہد نامہ میں ضرور ملے گی۔ یعنی کوئی نہ کوئی واقعہ یا واقعات ضرور ایسے ملیں گے جو اس کی طرف اشارہ کریں گے۔ اور حقیقت میں ایسا ہی ہے یعنی پرانا عہد نامہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ کہنا کہ پرانے عہد نامہ میں اس تعلیم کے متعلق کوئی اشارہ یا ایما نہیں پایا جاتا یہ ظاہر کرتا ہے کہ پُرانے عہد نامہ کا مطالعہ بالکل سطحی طور پر کیا گیا ہے۔ ہم اس جگہ لفظ "الوہیم" پر جو جمع کا صیغہ ہے زور نہیں دیں گے اور نہ اُن ضمائر پر زور دیں گے جو ذات الہی کے کے متعلق استعمال کی گئی ہیں لیکن جمع کی صورت رکھتی ہیں اور جو اکثر تثلیث پر اشارہ کرتی ہوئی مانی جاتی ہیں۔ عبری لوگ انہیں جمع کی ضمیروں کے سبب مانا کرتے تھے کہ ذات الہی میں کئی طاقتیں پائی جاتی ہیں جنہیں بت پرست الگ کر کے کسی ظاہری صورت کے وسیلے پوجا کرتے ہیں۔ مثلاً آسمان یا سورج کو اس کی طاقتیں سمجھکر سجدہ کرتے ہیں۔ قطع نظر ان باتوں کے ہم اُن خیالوں اور بیانوں کو اس تعلیم کے مؤید سمجھتے ہیں۔ جو پرانے عہد نامہ میں موجود ہیں اور جن سے آپ ہی آپ لازمی طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خدا کی ذات میں امتیاز پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہمارا اشارہ صرف تین باتوں کی طرف ہے (۱) وہ قابل غور واقعات جن کا ذکر بائبل کی زیادہ

پرانی کتابوں میں آتا ہے اور جو "یہواہ کے فرشتے" کے اظہاروں سے وابستہ ہیں۔ ان اظہاروں کی نسبت یہ بحث چلی آئی ہے کہ ہم اُس پُر راز ہستی کی نسبت جو اس نام سے موسوم ہے کیا خیال کریں۔ کیا اُسے خدا کا ایک عام ظہور تصور کریں۔ یا اسے ایک مخلوق فرشتہ تسلیم کریں۔ یا ایک خاص الٰہی شخصیت مانیں۔ ہم اُن علما کے ساتھ متفق ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ "ان اظہاروں پر غور کرنے کے بعد یہی لکھنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "ملک" (یعنی فرشتہ) جو خدا کے بندوں کو نظر آیا یہواہ ہی کا ایک اظہار تھا۔ وہ ذات میں یہواہ کے ساتھ ایک ہے۔ مگر ایک معنی میں (یعنی شخصیت کے اعتبار سے۔ مترجم) اس سے الگ ہے"۔ (۲) دوسری بات جس کی طرف ہمارا اشارہ ہے وہ تعلیم ہے جو روح پاک کے متعلق ہے۔ روح کا بیان بہت مفصل صورت میں پُرانے عہدنامہ کے اندر آتا ہے۔ عام طور پر تو روح ایک طاقت سی معلوم ہوتی ہے جو یہواہ میں سے نکلتی ہے۔ لیکن جب ہم اس کے کام یا فعل پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک علیحدہ شخص ہے۔ بائبل کے کئی مقاموں سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ خصوصاً یسعیاہ کے آخری ابواب میں کئی مقام ایسے آئے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً یسعیاہ ۴۰: ۱۳ میں آیا ہے۔ "کس نے خداوند کی روح کو انداز کیا۔ یا اس کا مشیر ہو کے اس کو سکھلایا"؟ ایک عالم کہتا ہے کہ اس مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ روح جو خلقت میں کام کر رہی ہے اپنے کام کو جانتی اور پہچانتی ہے۔ وہ ایک ایسی طاقت ہے جو عقل اور ادراک کی صفات سے متصف ہے۔ ایک اور عالم اس مقام کی نسبت یوں لکھتا ہے "یہ یسعیاہ کی ایک بڑی خصوصیت ہے کہ وہ روح کے شخص کو پیش کرتا ہے۔ مثلاً اس مقام میں پہچان اور تعقل صاف صاف طور پر روح سے منسوب کی گئی ہیں۔ (۳) تیسری بات غور طلب یہ ہے کہ ہم جدید کتابوں میں الٰہی حکمت کی وہ تعلیم پاتے ہیں جس نے بعد میں یہودی اور اسکندریہ

کے فلسفہ میں شخصیت کی صورت اختیار کی۔ اب گو ان باتوں سے جو پرانے عہد نامہ سے ظاہر ہوتی ہیں ثالوث مقدس کے مسئلہ پر بہت سی روشنی گرتی ہے۔ تاہم یہ تعلیم کامل صورت میں اس وقت کلیسیا میں رائج ہوئی جب بیٹا جسم میں ظاہر ہوا اور جب مسیح کی سرفرازی کے بعد روح کلیسیا پر نازل ہوئی ثالوث مقدس کی تعلیم وہ تعلیم ہے جو سب باتوں سے پہلے اس بات کو پیش کرتی ہے کہ ذات الٰہی کے اندر امتیازات پائے جاتے ہیں۔ اور اسی سبب سے اس پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ یہ تعلیم ہم سے ایک عقلی تناقض منوانا چاہتی ہے۔ یعنی ایک ایسی بات تسلیم کروانا چاہتی ہے جو عقلاً مانی نہیں جاسکتی کیونکہ اس میں تناقص پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک جانب تو وہ یہ کہتی ہے کہ خدا واحد ہے اور دوسری جانب یہ کہتی کہ تین ہیں یعنی وہ تین کو ایک اور ایک کو تین بتاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی اعتراض عام نہیں ہے۔ مگر یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ کیونکہ فقط ایک تنگ سے منطقی خیال پر مبنی ہے۔ یعنی یہ اعتراض اتنا اس بات پر نہیں کیا جاتا کہ خدا کے اندر جو تین طریق جداگانہ ہستی کے پائے جاتے ہیں اُن سے تشخص کیونکر منسوب کیا جاتا ہے۔ جتنا "ایک اور تین" پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ کوئی شے بھی دنیا میں ایسی ہے جس پر یہ اعتراض عاید نہ ہو سکے۔ خواہ آپ کوئی شے لیں آپ دیکھیں گے کہ وہ جنسیت کے اعتبار سے واحد ہے مگر صفات کے اعتبار سے ایک سے زیادہ۔ مثلاً انسان کی روح لیں۔ اگر کوئی چیز واحد ہے تو وہ واحد ہے۔ تاہم اس میں جو طاقتیں ہیں ہم اُن میں سے ہر ایک کو دوسری سے الگ کرتے ہیں۔ عقل۔ حافظہ۔ واہمہ اور ارادہ وغیرہ کئی طاقتیں ایک دوسری سے جدا جدا پائی جاتی ہیں تو بھی وہ سب ایک ہی روحانی ذات کے اظہار ہیں جو تقسیم نہیں ہو سکتی۔ پھر آپ کوئی زندگی لیں آپ دیکھیں گے کہ حالانکہ وہ ایک ہے تاہم اس میں گوناگوں کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ اور کیا یہ زندگی کا خاصہ نہیں ہے کہ وہ رنگارنگ کیفیتوں میں

اپنے آپ کو ظاہر کرتی اور انہیں میں اپنے آپ کو قایم رکھتی ہے؟ اس سے بھی ایک اور اعلیٰ مثال پر غور کیجئے۔ یعنی سلسلۂ موجودات کو لیجئے۔ آپ دیکھینگے کہ جب آپ اس بات کا جواب دیں گے کہ سلسلۂ موجودات کی اصل کیا ہے تو یہی اعتراض - یہی تناقض پیش آئے گا۔ بہت سی چیزیں جو نظر آتی ہیں (خواہ ہم کسی طرح سوچیں - وہ ایک ہی سے نکلی ہیں۔ پس ضرور ہے کہ اس ایک میں کئی طاقتوں کا مجموعہ موجود ہو اور اسکی نسبت یہ بھی مانا جائے کہ وہ ایک اپنے آپ کو بہتوں میں ظاہر کر سکتی اور اُن بہتوں میں سے ہر ایک کو دوسرے سے ممتاز ٹھہرا سکتی ہے - یہ بات جس طرح ہمہ اوست کے اصول کے مطابق درست ہے۔ یا جس طرح مسٹر سپنسر کے اس خیال کے مطابق صحیح ہے کہ ایک نامعلوم طاقت مادہ اور عقل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح مسیحی تعلیم کے مطابق بھی صحیح ہے۔ یونان کے قدیم فلاسفروں کے درمیان اس مشکل سوال پر بہت بحث ہوتی تھی اور ہم جانتے ہیں کہ ان فلاسفروں کی کوششوں کا جو ایلیاٹکس کہلاتے تھے۔ اور جو لامحدود کی وحدت کو بلکہ ہر طرح کے امتیازات کو ماننا چاہتے تھے کیا نتیجہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس تصور کو کہ خدا ایک ایسی لامحدود ہستی ہے جس میں کسی طرح کا امتیاز شخصی نہیں ہے۔ جو کسی طرح ایک سے زیادہ نہیں۔ جس میں نہ تبدیلی نہ حرکت وغیرہ پائی جاتی ہے چھوڑ کر یہ ماننے لگ گئے کہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ محض ایک بے حقیقت دکھاوا ہے۔ اور کوئی چیز حقیقت میں موجود نہیں ہے۔ یعنی دنیا کی ہستی سے بھی منکر ہو گئے۔ اسی مشکل کو مغلوب کرنے کے لئے افلاطون اور اس کے بعد والوں نے اس بات پر زور دیا کہ خدا کا وہی تصور صحیح ہے جس میں اُس کے ذاتی امتیاز کا عنصر موجود ہو۔ اس سے اسطوئیقی فلاسفروں اور فیلو کی تعلیم متعلق لوگاس کے پیدا ہوئی۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کی جو اعلیٰ عقلی تحریکیں ہیں۔ ان کی کلید بھی یہی خیال ہے کہ ذات الہٰی میں ذاتی امتیاز موجود ہے۔ اب یہ عقلی

تصورات قابل اطمینان ہوں یا نہ ہوں ان سے کم از کم یہ بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ ثالوثی تصور جو مسیحیوں کے درمیان مروج ہے ایسا لچر خیال نہیں ہے جیسا کہ لوگ اپنی ناواقفیت کے سبب سے اکثر سمجھ لیتے ہیں۔ بلکہ اس میں عقلی قیاس کے اعلیٰ درجہ کے عناصر موجود ہیں +

بحث اس بات پر نہیں ہے کہ مسیحی مذہب خدا کی ذات میں امتیازات بتاتا ہے۔ بحث اس بات پر ہے کہ جو امتیازات مسیحی مذہب خدا کی ذات میں بتلاتا ہے وہ شخصی (پرسنل) ہیں۔ کلیسیا کے درمیان بھی اس بات پر بحث ہوتی آئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ امتیاز کیسا ہے؟ ذاتی ہے۔ یا محض کام کے متعلق ہے؟ باطنی ہے یا محض کشف کے متعلق ہے۔ شخصی ہے یا غیر شخصی ہے؟

ہم مانتے ہیں کہ جب لفظ "شخص" الہی امتیازوں کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو واقعی بہت سی دقتیں پیش آتی ہیں جن کو ہم نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ اعتراض جو کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مسیحی مذہب کے رو سے خدا تین جداگانہ وجودوں سے مل کر بنتا ہے اور کہ وہ وجود ایک دوسرے سے اسی طرح متفرق اور ممتاز ہیں جس طرح انسانی وجود ایک دوسرے سے الگ اور جدا جدا ہیں۔ اب یہ خیال واقعی خدا کی وحدت کے خلاف معلوم ہے یاد رہے کہ انگریزی لفظ "پرسن" جس کا ترجمہ شخص یا اقنوم کیا جاتا ہے۔ لاطینی زبان سے آیا ہے اور یونانی کلیسیا جس لفظ کو اس کے مرادف کے طور پر استعمال کرتی تھی وہ ہیپاس ٹیسس تھا۔ لیکن لاطینی اور یونانی ہر دو کلیسیاؤں کا مطلب بزرگ اگسٹن کے قول کے مطابق ایک ہی تھا۔ بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے سو یہ ہے کہ یہ لفظ (پرسن) "بمعنی شخص" نوشتوں میں کہیں نہیں آیا لہذا اس پر حد سے زیادہ زور نہیں دینا چاہئے۔ تاہم کوئی اور لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو ان امتیازات کی حقیقت کو جو باپ۔ بیٹے اور روح القدس کے ناموں

سے مترشح ہوتی ہے بخوبی ظاہر کر سکے اور جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ ذات الٰہی میں تین مرکز علم اور محبت اور ارادہ کے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ساتھ ہی الگ الگ بھی ہیں۔ مگر ایسے الگ نہیں جیسے انسان انسان سے الگ ہوتا ہے۔

پس یہ تسلیم کر کے کہ لفظ "شخص" سے ذات الٰہی کے وہ امتیازات مفہوم ہوتے ہیں جو الفاظ میں۔ تو۔ اور وہ کے استعمال سے بخوبی اظہر ہوتے ہیں اور ساتھ ہی یہ مان کر اس کے استعمال سے "ذات" کی وحدت میں کچھ فرق نہیں آتا ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ ثالوث مقدس کے امتیازات شخصی (پرسنل) ہیں۔ یوں تو دیکھتے ہی خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ باپ۔ بیٹے اور روح کے نام شخصی امتیاز پر دلالت کرتے ہیں خصوصاً پہلے دو نام اور اگر پہلے دو اس پر دال ہیں تو تیسرا بھی دلالت کرے گا۔ لیکن علاوہ اس کے وہ تمام حقیقتیں اور گواہیاں جو یہ بتاتی ہیں کہ مسیح میں خدا شخصی طور پر مجسم ہوا اور کہ وہ شخص جو مسیح میں مجسم ہوا وہ باپ سے باعتبار شخصیت کے الگ ہے اس صداقت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اسی طرح وہ تمام حقیقتیں اور گواہیاں بھی جو یہ بتاتی ہیں کہ روح القدس جسے مسیح بطور رہنما اُستاد اور تسلی دینے والے کے بھیجتا ہے الٰہی شخص ہے اور باپ اور بیٹے سے الگ ہے اسی صداقت کی تصدیق کرتی ہیں۔ روح کی شخصیت ثابت کرنے کی ہم کو ضرورت نظر نہیں آتی کیونکہ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو بیٹے کی شخصیت مان کر روح کی شخصیت کا انکار کرتے ہوں۔ گو یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ بیٹے کی الوہیت اور روح کی شخصیت ثابت کرنا مشکل ہے تاہم یہ بات ہم دیکھنے میں آئی ہے کہ لوگ بیٹے کی الوہیت اور شخصیت مان کر روح کی شخصیت کے منکر ہوئے ہوں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ اگر باپ اور بیٹے کے امتیاز کو تسلیم کریں تو یہ ضروری امر ہے کہ ثالوث کے دائرہ کو مکمل کرنے کے لئے روح کو بھی تسلیم کیا جائے۔

دوسرا عقیدہ کہ خدا کی ذات کے امتیاز محض کشفی ہیں حقیقی نہیں ہیں یعنی ایک خدا نے اپنے تئیں تین صورتوں میں ظاہر فرمایا ہے ایسا عقیدہ ہے جسے بہت لوگ قدیم زمانے میں مانتے تھے اور موجودہ زمانہ میں بھی مانتے ہیں۔ لیکن یہ عقیدہ پاش پاش ہو جاتا ہے جب ہم کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ بیٹے کا تجسم حقیقی ہے۔ علاوہ بریں خود اس تصور میں بہت سے نقص اور تناقض پائے جاتے ہیں مثلاً سبیلیس (Sabellian) تصور کے مطابق خدا کبھی باپ کی حیثیت میں ظاہر ہوا اور کبھی بیٹے کی حیثیت میں۔ اس خیال کی موجودہ صورتیں اس مشکل سے چھوٹنے کے لئے یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ مسیح اخلاقی طور پر بیٹا ہے لیکن الوہیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ رائے ایسی ہے جو ہمیں کشفی تثلیث سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ اس کے مطابق خدا باپ اور خدا روح تو رہ جاتے ہیں لیکن خدا بیٹا نہیں رہتا بیٹا باپ کا مکاشفہ پہنچانے والا اور اس کا ظاہر کرنے والا تو مانا گیا ہے مگر وہ خود الہی دائرہ سے علاقہ رکھنے والا نہیں مانا گیا ہے ✣

اور اگر ہم روتھے یا بالسخ وغیرہ کے ساتھ مل کر یہ مانیں کہ بیٹا بعد میں الہی بن گیا تو ہم نے تثلیث کے دائرہ میں ایک اور شخص کو بڑھا دیا جو پہلے وہاں نہ تھا۔ لیکن یہ بھی درست نہیں۔ پس ہماری رائے میں سب سے بہتر اور درست بات یہی ہے کہ ہم نوشتوں کے ان بیان کو پکڑے رہیں جو یہ سکھاتا ہے کہ حقیقی اور سچے معنی میں ایک الٰہی شخص یعنی ازلی بیٹا انسانیت کے دائرہ میں داخل ہوا اور یوں تشخصیتوں کی تثلیث کو تسلیم کریں ✣

اب اس سوال پر غور کرنا باقی رہ گیا ہے کہ تثلیث کا عقیدہ عقل اور تجربہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے۔ شاید اس کا یہ جواب دیا جائے کہ یہ عقیدہ ایسا ہے جس کا قبول کرنا ایمان پر منحصر ہے لہذا عقل کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ لیکن ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اگر ثالوث کا مسئلہ صحیح ہے

تو ایسا کہنا روا نہیں ہے۔ کیونکہ ضرور ہے کہ اس مسئلہ کے سمجھنے میں عقل کا کچھ نہ کچھ دخل ہو۔ یا تبدیل الفاظ یوں کہو کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ کسی طرح بھی عقل میں نہ آئے۔ ایسے عظیم الشان مسایل کی نسبت یہ کہنا کہ وہ بالکل راز سربستہ کی طرح نامعلوم ہیں ہم کو پسند نہیں۔ اس میں سمجھ کو کچھ نہ کچھ دخل ہے ورنہ تثلیث کا خیال ہی کلیسیا میں کس طرح پیدا ہوا۔ اس خیال کا موجود ہونا ہی ظاہر کر رہا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کسی نہ کسی درجہ تک انسان کی عقل و ادراک کے دائرہ میں داخل ہے ٭

ہم اس جگہ اُن دلایل کا ذکر نہیں کریں گے جو آگسطن اور دیگر مصنفوں کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور یہ دکھانے کے لئے پیش کی گئی ہیں کہ روح کی ساخت کے اندر تثلیث کی مثال پائی جاتی ہے۔ اگسطن نے بڑی نکتہ سنجی سے روح کی تشریح کی ہے اور دکھایا ہے کہ روح کا تعلق اُس علم کے ساتھ جو وہ اپنی نسبت رکھتی ہے کیا ہے اور ان دونوں یعنی روح اور روح کے علم ذاتی کا تعلق اس محبت کے ساتھ جو روح اپنے ذات سے رکھتی ہے کیا ہے۔ اور نیز اس کی وہ تشریح جو اس نے حافظہ اور عقل اور ارادہ کے باہمی تعلقات کی نسبت کی ہے غور طلب ہے۔ اور اسی طرح وہ مشابہت جو اُس نے الٰہی کلمہ اور ہمارے اندرونی اور باطنی کلمہ کے درمیان دکھائی ہے۔ اور نیز وہ مشابہت جو اس نے روح القدس اور محبت کے درمیان ظاہر کی ہے۔ ایسی باتیں ہیں جن میں اس قسم کی گہری صداقتیں چھپی ہوئی ہیں کہ لوگوں نے اُن کو اکثر بخوبی نہیں دیکھا ہے۔ تاہم مشابہتوں کی ناکاملیت کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے اور معترف ہے کہ ان سے زیادہ تر طاقتوں کی نہ کہ شخصیتوں کی تثلیث ثابت ہوتی ہے۔ مگر ہم اپنی نسبت یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنے میں اس قسم کے امتیازوں کا کوئی سراغ ڈھونڈتے تو ہم اس طاقت میں اس کو تلاش کرتے جس کے مطابق روح اپنے آپ سے ہمکلام ہوتی ہے۔ جس کے

مطابق وہ بیرونی دنیا کو خارج کر کے خود اپنے آپ سے گفتگو کرتی - اپنے ہی ساتھ بحث کرتی ہے - آپ ہی سوال کرتی آپ ہی جواب دیتی ہے آپ ہی مشکلات برپا کرتی آپ ہی اُن کو رفع کرتی ہے - آپ ہی اعتراض کھڑے کرتی اور آپ ہی اُن کو حل کرتی ہے - اور ساتھ ہی آپ ایسے طور پر الگ کھڑی رہتی ہے کہ گویا ثالث کا کام دے رہی ہے۔ جو سوال وجواب ہو رہے ہیں اُن کو سُن رہی ہے - اچھے اور معقول جواب کو سنکر عش عش کرتی اور نامعقول بات سنکر اس پر فتوی لگاتی ہے گویا ایک ہی روح تین طرح کا کام کرتی ہے - آپ ہی سایل اور آپ ہی مجیب ہے - اور آپ ہی ثالث - تاہم یہ تثلیث ایک ناقص سی تثلیث ہے - لیکن وہ ہماری روحانی زندگی کے دیگر عناصر کے ساتھ مل کر ہمیں کم از کم یہ بتا رہی ہے کہ اگر روح انسانی کے اس قسم کے امتیازات ذرا اور گہرے ہو جاتے تو کچھ کچھ پتہ مل جاتا کہ الہٰی تثلیث کیا معنی رکھتی ہے ٭

لیکن جب ہم ان تشبیہوں اور مشابہتوں کو جو روح کی طاقتوں میں تلاش کی جاتی ہیں چھوڑ دیتے اور اس بات پر غور کرتے ہیں کہ خود شناسی اور شخصیت اور محبت کون سی حالتوں میں موجود ہو سکتی ہیں تو ہمیں تثلیث کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے - اور فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کی ذات کا تثلیثی تصور فلسفہ اور تھیالوجی (علم الہٰی) کے رو سے کیا خوبی رکھتا ہے اور کن باتوں کے سبب سے یہ تصور مواحدانہ (یونیٹیرین) تصور پر فوقیت رکھتا ہے ٭

(۱) اس مسئلہ کا تعلق خدا کی خود شناسی - اور علم اور شخصیت کے ساتھ ہے - علم ہمیشہ عالم اور معلوم پر دلالت کرتا ہے - اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک جاننے والا ہے اور دوسری وہ شے ہے جو جانی گئی ہے - لیکن اہل فلسفہ علم کی اس بلند منزل کا ذکر بھی کیا کرتے ہیں جہاں عالم اور معلوم کا امتیاز بیچ سے اُٹھ جاتا ہے اور وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں لیکن

ان کے بیان سے یا یوں کہو کہ ان کے الفاظ سے کوئی بات ذہن میں نہیں آتی کیونکہ جس علم کو ہم علم کہتے ہیں وہ صرف وہ علم ہے جس کے وسیلے سے جاننے والا اپنے آپ کو کسی اور سے جو اس کا غیر ہے امتیاز کرتا ہے اور پھر اس امتیاز کے وسیلے اپنا اور اپنی حالتوں اور طاقتوں کا علم حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اپنا علم (خود شناسی کا علم) بیرونی دنیا کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر بعض لوگوں نے کہا ہے کہ خدا بھی اپنا علم خارجی دنیا کے وسیلے حاصل کرتا ہے۔ اُن کی نگاہ میں خارجی دنیا خدا کے علم النفس کی پہچان کے دائرہ میں وہی جگہ رکھتی ہے جو بیٹا متعلق اس بات کے مسیحی تھیالوجی (علم الٰہی) میں رکھتا ہے۔ لیکن ان کے اس خیال پر کئی اعتراض وارد ہوتے ہیں ‌‌٭

(الف) اس سے لازم آتا ہے کہ خدا خارجی دنیا کا محتاج ہے کیونکہ اگر خارجی دنیا کا تصور اُسے نہ ہوتا تو اس کو اپنا علم نہ ہوتا ٭

(ب) چونکہ وہ چیز جس کا علم ذاتی علم کے حصول کا وسیلہ ہے ایک ایسی چیز ہے جو آپ شروع سے موجود نہیں بلکہ اس کا تصور موجود ہے لہٰذا وہ شے ذات الٰہی کی خود شناسی کا وسیلہ نہیں بن سکتی اگر یہ بات صحیح ہے کہ اپنا علم بغیر دوسری شے کے حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر ایک ازلی شے کے علم کے لئے حادث شے کے محض تصور کو ایک وسیلہ ٹھیرانا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ہیگل کی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے جو اس خیال کو کہ "میں ایک دنیا بناؤں گا" ذات الٰہی کے علم النفس کا وسیلہ نہیں ٹھیراتا بلکہ دنیا کو اس کا وسیلہ ٹھیراتا ہے یعنی اس کے نزدیک دنیا ازل سے ہے۔ کیونکہ اگر ازل سے نہ ہوتی تو خدا اپنے آپکو کس طرح پہچانتا ٭

(ج) لیکن دنیا محدود ہے لہٰذا ایک لامحدود علم النفس کی شناخت کا وسیلہ نہیں ہو سکتی ٭

(د) آخری اعتراض یہ ہے کہ دنیا ایک ایسی شے ہے جو شخصیت

نہیں رکھتی۔ لیکن خدا ایک شخص ہے۔ مگر شخصیت اپنے آپ کو پورے طور پر نہیں پہچان سکتی جب تک کہ "میں" کے مقابلہ میں "تو" نہ ہو یعنی جب تک خود (سیلف) کو اپنا جواب دوسرے خود (سیلف) میں نہ ملے تب تک شخصیت کے راز شخصیت رکھنے والے پر پوشیدہ رہتے ہیں۔

پس اس دلیل کے وسیلے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ خدا کی خود شناسی اشیاء خارجی پر مثل دنیا وغیرہ کے موقوف نہیں ہے۔ لہذا اس کا وسیلہ خود ذات الہی میں ہی موجود ہونا چاہئے۔ بہ تبدیل الفاظ یوں کہو کہ ذات باری میں امتیاز کا ہونا ضروری ہے۔ پس ذات باری کی خود شناسی کا وسیلہ ذات الہی کے اندر ہی پایا جائے گا اور وہ وسیلہ نہ محض تصور ہوگا۔ نہ محدود اور نہ غیر شخصی۔ بلکہ وہ ایک ایسا وسیلہ ہوگا جس میں خدائے تعالیٰ اپنی شخصی صورت کا کامل اظہار معاینہ کرے گا۔ جس کی نسبت کلام نے یہ شہادت دی ہے کہ وہ خدا کے جلال کی رونق اور اس کی ماہیت کا عکس ہے"۔ اور جب بیٹے کا وجود ثابت ہوگیا تو روح کے وجود کا ماننا تاکہ الہی ہستی کا دائرہ مکمل ہو مشکل نہ ہوگا۔

اس قیاس کی بنا پر تثلیث کی خوبی اظہر ہے۔

(۲) لیکن دوسری دلیل الہی محبت پر مبنی ہے۔ جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ الہی محبت کیا ہے تو ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ الہی محبت کی موجودگی کے لئے بھی ذات الہی میں امتیاز کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ اس کی خود شناسی کے لئے۔ عالمان علم الہی اس دلیل کو بہت کام میں لاتے ہیں۔ اور اس کا طرز یہ ہے۔ "خدا محبت ہے" لیکن محبت سے مراد "اپنے آپ کو دوسرے پر ظاہر کرنا" ہے۔ کیونکہ محبت بغیر محبوب کے ہو نہیں سکتی۔ پس اگر خدا محبت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ازل ہی سے اس کا محبوب بھی موجود ہے۔ مگر یہ محبوب دنیا نہ باعتبار اپنے تصور کے اور نہ باعتبار اپنے حقیقی وجود کے ہو سکتی ہے۔

اور اسکی تردید میں وہی دلیل پیش کی جاسکتی ہے جو اوپر پیش ہو چکی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر دنیا خدا کا محبوب ہے تو خدا دنیا کا محتاج ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ خدا کامل محبت اپنے ہی میں رکھتا ہے اور اس کی بھرپوری میں سے دنیا کو پیار کرتا ہے۔ علاوہ بریں دنیا محدود شے ہے۔ پس خدا کی لامحدود محبت کا محبوب نہیں ہو سکتی۔ پس اگر خدا اپنی ذات ہی میں محبت ہے تو ضرور ہے کہ اس کی محبت کا کامل اور ازلی محبوب بھی اسی میں موجود ہو۔ اور نوشتوں کی تعلیم ازلی بیٹے میں اسی قسم کا محبوب پیش کرتی ہے۔ جب ہم روح القدس کے وجود اور شخصیت کو جو باپ اور بیٹے کی محبت کا وسیلہ اور رشتہ ہے قبول کر لیتے ہیں تو ذات الٰہی کا یہ تصور پورا ہو جاتا ہے۔

اس مسئلہ یا تعلیم کی خوبی کو اور زیادہ محسوس کرنے کے لئے ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اگر یہ تعلیم صحیح نہیں بلکہ برعکس اس کے خدا کی وحدت کا خیال صحیح ہے تو پھر خدا کی محبت کا کیا حال ہوگا۔ اگر خدا میں امتیازات شخصی پائے نہیں جاتے تو اس کا محبوب ازل سے سوائے خود کے اور کچھ نہ رہا۔ اور اس حالت میں یونیورس (عالم موجودات) میں وہ محبت جو ہمیں معلوم ہے نہ رہی۔ یعنی محب کی محبت کا محبوب پر عاید ہونا باقی نہ رہا بلکہ اس کے عوض میں واحد مطلق کی مَیں باقی رہ گئی۔ یعنی ایک ایسی ہستی رہ گئی جو محض اپنے آپ کو پیار کرتی ہے اور بس۔ پس ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کی محبت کا محبوب ایک محدود دنیا ہے۔ یا یہ ماننا پڑے گا کہ محبت کی لامحدود مبارک زندگی خود خدا ہی میں موجود ہے۔ اور یہ دوسرا اعتقاد ثالوث مقدس کا اعتقاد ہے۔

اس تعلیم کی وقعت اخلاقی صورت میں اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ ہم اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ ہم اس ہستی کے ساتھ صحبت اور رفاقت رکھ سکتے ہیں جو خود اپنے میں رفاقت کا اصول رکھتی ہو۔

(۳) تیسری بات خدا کی ابوّت ہے۔ اس سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ خدا باپ ہے۔ یہ مبارک نام خود مسیح کا بتایا ہوا نام ہے اور اس رشتہ پر دلالت کرتا ہے جو خدا اُن کے ساتھ رکھتا ہے جو اس پر تکیہ کرتے اور اس کی صورت کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن باپ اور بیٹے ایسے الفاظ ہیں جو ایک باہمی رشتہ پر دلالت کرتے ہیں۔ پس اگر خدا باپ ہے تو ہم اس بیٹے کو جو باپ کے رشتہ کا جواب ہے کہاں ڈھونڈیں؟ اگر ہم یہ کہیں کہ وہ بیٹا انسان ہے یا خلق کئے ہوئے ملائکہ ہیں یا کوئی اور مخلوق شے ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا اس رشتہ کی تکمیل کے لئے محتاج خلقت کا ہے۔ گویا خود بحیثیت خدا باپ نہیں ہے۔ بلکہ جب خلقت کو خلق کرتا ہے تب ہی باپ بنتا ہے۔ گویا ابوّت کا عنصر اُس کی ذات میں داخل نہیں ہے۔ مسٹر۔ آر۔ ایچ۔ ہٹن صاحب نے تجسم پر جو رسالہ لکھا ہے اس میں اُنہوں نے اس بات کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے۔ ہم اُن کی تحریر میں سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"اگر مسیح خدا کا ازلی بیٹا ہے تو خدا اپنی ماہیت اور ذات میں باپ ہے اور سوشل نیچر اور محبت کا خاصہ ازلی ہستی کی ذات کا اصول ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کا صدور اور اس کی محبت کا اس کے محبوب پر وارد ہونا وقت کے دائرہ سے بلند و بالا ہے اور خدا کی ماہیت سے علاقہ رکھتا ہے پس موحدوں کا یہ خیال کہ خدا محض ایک خدا ہے اور اپنی ذات میں ایک واحد اور تنہا شخصیت ہے جب بخوبی معلوم ہو جاتا ہے تو اس کی بنا پر خدا کی ذات کی طرف کسی طرح کی سوشل صفات کا منسوب کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر ہمیں یہ ماننا ہے کہ باپ ہر وقت اور ہر زمانہ میں باپ ہے تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا تو اس میں محبت بالفعل اور بالقوا عار ہمیشہ موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ زندگی اور خیال اور خوشی کی بھرپوری کا باپ سے

نکلنا اور بیٹے پر وارد ہونا خدا کی ذات پاک کا خاصہ ہے۔ اور کہ جس طرح کبھی خدا کا شروع نہیں ہوا اسی طرح اس خاصۂ ذات الٰہی کا شروع بھی کبھی نہیں ہوا"۔

(۴) آخری بات پر غور کئے گئے لایق یہ ہے کہ تثلیث کی تعلیم اس رشتہ کے ساتھ جو خدا اور دنیا میں پایا جاتا ہے ایک گہرا تعلق رکھتی ہے۔ نوشتوں نے بیٹے کو خلقت کے ساتھ بے وجہ مربوط نہیں کیا جب اُنہوں نے یہ بتایا کہ اُس کی شخصیت اور اس کا کام خلقت کی پیدائش کے متعلق خاص معنے رکھتے ہیں۔ ہم اس رشتے کے متعلق جو خدا دنیا کی نسبت رکھتا ہے دو خیال رکھ سکتے ہیں۔ اول یہ کہ خدا خود دنیا سے ایسا بلند و بالا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ واسطہ نہیں رکھتا۔ اور دوسرا یہ ہے کہ وہ باطنی طور پر اس میں اس طرح موجود ہے کہ جو دنیا ہے سو وہ ہے۔ پہلے خیال کو ڈی ازم کہتے ہیں۔ اور دوسرے کو پنتھئیزم (ہمہ اوستی)۔ ان دونوں خیالوں کے درمیان یہ خیال آتا ہے کہ خدا دنیا سے بلند و بالا بھی ہے اور خلقت کے بیچ بھی موجود ہے۔ اور یہ مسیحی تصور ہے۔ اب اس دُہرے تعلق کو قایم کرنے اور قایم رکھنے کے لئے فیلو نے جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں لاگاس (کلمہ یا عقل) کو خدا اور خلقت کے درمیان ایک حد اوسط قرار دیا۔ اور اسی واسطے اُن فلاسفروں نے جو نیو پلیٹونسٹس کہلاتے تھے اس بات میں کہ خدا دنیا کا (νους) نوس یعنی ذہن ہے اور اس بات میں کہ وہ اس کی روح ہے تفریق کی کیونکہ جب حد اوسط موجود نہیں ہوتی تو پھر وہی وحدت کا پھیکا سا قیاس اور غیر متحرک سا خیال باقی رہ جاتا ہے۔ جو آخری طبقہ کے یہودیوں کے درمیان مروج ہے۔ لیکن اگر اس پھیکے سے خیال سے ہم پہلو تہی کرنا چاہیں تو ہمیں پنتھیئسٹک خیال میں غرق ہو کر خدا سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مگر ثالوث مقدس کی مسیحی تعلیم میں ان

ہر دو قسم کی غلطیوں کے زہر سے بچنے کا تریاق پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی وہ کڑی بھی مل جاتی ہے جس کے دستیاب کرنے کے لئے اہل فلسفہ نے بے فایدہ سر دردی اپنے اوپر روا رکھی ہے۔ اب ان ساری باتوں سے یہی نتیجہ نکلا کہ ذات باری کے متعلق جو تصور مسیحی مذہب رکھتا ہے وہی زندہ تھی ازم (خدا کی ہستی کے عقیدہ) کا سچا محافظ ہے۔ ورنہ خدا کی ہستی کا تصور ڈی ازم اور پنتھی ازم میں سے ایک کے ساتھ مل جائیگا لیکن یہ دونوں اس کے لئے مضر ہیں ؛

۲۔ ہم جس نتیجہ پر اس وقت پہنچ گئے ہیں اس پر مزید غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ ثالوث کی تعلیم کا ایک خاص کام یہ ہے کہ وہ خلقت اور نجات کے ہر دو کاموں کو ہی سلسلہ میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ گویا ظاہر کرتی ہے کہ یہ دونوں کام ایک کل کے دو بڑے بڑے جزو ہیں اور کہ مسیح مخلوقات کا مختار کل ہے اسی طرح خلقت کا پہلوٹھا ہے جس طرح کہ مُردوں میں کا پہلوٹھا ہے۔ یہ خیال کہ بیٹا وہ کڑی ہے جو خدا اور خلقت کے درمیان پائی جاتی ہے ہمیں دوسرے مضمون کی طرف لے جاتا ہے جس کے متعلق ہم کچھ تذکرہ اس باب میں کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ تجسم کا مسئلہ دنیا کی تجویز کے ساتھ کیا علاقہ رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تثلیث کا مکاشفہ نجات کے کام کے متعلق دیا گیا ہے۔ لیکن جب ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تثلیث ایک حقیقت ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا تعلق خلقت کے کام کے ساتھ بھی ہے۔ چنانچہ نئے عہدنامہ کے مصنف اس بات کو اچھی طرح پیش کرتے ہیں۔ مثلاً پولوس اور یوحنا اور عبرانیوں کے خط کا مصنف نجات کی باتیں کرتے کرتے اپنے استدلال میں ازلیت کی طرف چلے جاتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ خلقت کے پیدا کرنے میں اصل عامل بیٹا ہی تھا۔ مکاشفات کی کتاب مسیح کو شروع یعنی اصول (ἀρχή) خلقت کا بناتی ہے (دیکھو مکاشفات ۳: ۱۴)

اور جب ایک بار یہ خیال جو بار بار برپا ہوتا رہا ہے اور جس پر بار بار کلیسیا بحث کر چکی ہے سامنے آجاتا ہے تو ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے - اور وہ یہ ہے کہ کیا تجسم کا تصور خلقت کی اصل تجویز میں داخل تھا یا نہ تھا؟ کیا اگر انسان نہ گرتا تو پھر بھی تجسم وقوع میں آتا یا نہ آتا؟ کیا تجسم کا مسئلہ اس علت غائی سے جو خلقت کی پیدایش سے مقصود تھی کچھ تعلق رکھتا تھا یا اس کا تعلق محض گناہ کے دخل اور نجات کی ضرورت کے ساتھ تھا ÷

بعض حضرات اس قسم کے سوال کی بحث کو بے سود اور تضیع اوقات سمجھیں گے - کیونکہ اُنکے نزدیک بائیبل اس کا جواب صاف نفی میں دیتی ہے - وہ کہتے ہیں کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں اس غرض سے بھیجا ہے - کہ انسان اس کے وسیلے سے نجات حاصل کرے - اور خدا اس کے ذریعہ سے اپنی بے انتہا محبت کو ظاہر فرمائے - جو گنہگاروں کیلئے اسکے دل میں موجود ہے - پس اُنکے نزدیک تجسم کی ضرورت ہی نہ ہوتی اگر دنیا میں گناہ نہ آتا - لہذا وہ یہ کہتے ہیں کہ کفارہ کے مسئلہ سے تجسم کو الگ کر کے اس پر غور ہی نہیں کرنا چاہئیے - لیکن اُن کے اس خیال کو قطعی طور پر تسلیم کرنے سے پیشتر بعض امور پر غور کرنا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے ÷

اوّل - اس مسئلہ پر غور کرنے کا سوال تجسم کے سے عظیم واقعہ سے خود بخود پیدا ہوتا ہے ÷

دوم - یہ سوال صدہا برسوں سے کلیسیا کے سامنے رہا - اور بڑے بڑے مسیحی عالم اور فلاسفر اس پر بڑی متانت سے غور و خوض کرتے رہے ہیں - اور بقول پرنسپل فیربرن صاحب آج کل کے مشہور و معروف عالمان الہیات بھی اس کی حمایت اور تائید میں کمر بستہ نظر آتے ہیں - گو پرنسپل صاحب خود اُن کے خیال کو صحیح اور معقول تسلیم نہیں کرتے ÷

سوم - بائیبل کے بعض مقامات سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے جو اعتراض تجسم اور نجات کے تعلق پر عائد ہوتا ہے - وہی بائیبل کی تعلیم پر بھی جو بیٹے اور آفرینش کے باہمی علاقہ کے متعلق ہے وارد ہو سکتا ہے - مگر مسیحی تصور کی

اعلیٰ خوبی اور شان اس امر میں پائی جاتی ہے۔ کہ وہ سب سے پہلے ان ضرورتوں کی مدافعت کا تدارک کرتا ہے جو ہماری حقیقی گناہ آلودہ حالت سے وابستہ ہیں اور پھر ان وسیع اور عظیم اصولوں کو پیش کرتا ہے جو گنہگار انسان کی ضرورتوں سے بلند و بالا ہیں

ہمارے واسطے ضروری نہیں۔ کہ ہم اس مسئلہ کی تاریخ پر بحث کریں۔ مشہور عالم ڈاکٹر وورنر[۱] اور بشپ ویسٹ کاٹ صاحب نے اپنی کتابوں میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ اور آرچ بشپ ٹرنچ نے کیمبرج یونیورسٹی کے وعظوں میں بھی اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے۔ ان عالموں کی رائے میں انسان کا گناہ تجسم کا موجب نہ تھا۔ اور اس خیال کے حامی رہ تھے۔ لیننگ۔ مارٹن سن۔ ایبرارڈ۔ اور بہت سے دیگر مسیحی عالم ہیں۔ اور اسکی ضد میں پرنسپل فیئربرن کا خیال ہے۔ جو آپ نے اپنی "ٹائیالوجی" میں کمال خوبی اور برہان کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس بحث پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ صداقت کلیہ طور پر ایک جانب نہیں پائی جاتی بلکہ اس مسئلہ کا ایک اور پہلو ہے۔ جہاں کسی طرح کے اعتراض کو جگہ نہیں یہ تو خوب روشن ہے کہ صرف انسان کا گناہ تجسم کا باعث ہوا۔ بائبل کے بیانات سے اسکی تائید خاطر خواہ ہوتی ہے مثلاً مقامات مندرجہ ذیل اس پر شاہد ہیں۔ "ابن آدم کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈنے اور بچانے کو آیا۔" (لوقا ۱۹: ۱۰) "خدا نے جہان کو ایسا پیار کیا۔ کہ اپنا اکلوتا بیٹا بخشا۔ تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے" (یوحنا ۳: ۱۶) "خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا۔ جو عورت سے پیدا ہوا۔ اور پیدائش سے شریعت کا ماتحت بنا۔ تاکہ شریعت کے ماتحتوں کو مول لے کر چھڑائے اور ہم کو لے پالک ہونے کا درجہ ملے" (گلتی ۴: ۵) "خدا کا بیٹا اس واسطے ظاہر ہوا۔ کہ وہ شیطانوں کے کاموں کو نیست کرے" (۱ یوحنا ۳: ۸) اور بھی بہت سی آیات نقل کی جاسکتی ہیں جن سے یہ عیاں ہوتا ہے

۱ History of the Doctrine of the Person of Christ. Gospel of the creation

۲ یوحنا کے خطوط کی تفسیر کے ساتھ ایک مضمون بطور ضمیمہ منسلک ہے ؛

کہ مسیح انسان کو نجات دلانے کے لئے اس دنیا میں آیا تھا۔ وہ خدا کی محبت کا بے بہا عطیہ ہے۔ جس کے طفیل سے گنہگار بنی آدم نجات حاصل کرتے ہیں لیکن برعکس اس کے یہ محبت پیش کی جاتی ہے۔ کہ اگر ایک طرف بائبل تجسم کو نجات کے واسطے لابدی ٹھیراتی ہے تو دوسری جانب ایسی آیتیں بھی پائی جاتی ہیں جس سے اس مسئلہ کی بابت ایک زیادہ وسیع خیال پیدا ہوتا ہے۔ جو آیات اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں اُن کا حوالہ پیشتر دیا جا چکا ہے۔ اُن سے بیٹے اور آفرینش عالم کا ابتدائی رشتہ روشن ہو جاتا ہے۔ یعنی اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلسلہ موجودات اسی کے وسیلے سے پیدا کیا گیا تھا۔ اور کہ سب اشیا اسی میں قایم ہیں۔ اور کہ وہ مخلوقات میں پہلوٹھا ہے۔ اور سب چیزیں اسی کے واسطے پیدا کی گئی ہیں۔ اس تعلق میں ڈاکٹر لائٹ فٹ لکھتے ہیں وہ کلمہ ہی عالم کی علت غائی اور وہی اس کا موجد ہے۔ "نہ صرف ارخے (اول) ہے بلکہ تیلاس (آخر) بھی ہے"۔ ان اقتباسات کی طرف ہم بعد میں رجوع ہوں گے۔ پھر اس خیال کی تائید میں یہ بھی کہا جاتا ہے اور بڑے زور کے ساتھ کہ تجسم کا سا بے نظیر واقعہ محض ایک امر اتفاقی نہیں سمجھا جا سکتا۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تجسم محض گناہ کے نتیجوں کو دور کرنے کی ایک تدبیر تھی جو خدا کی ازلی تدبیر میں شامل نہ تھی۔ مگر ضرورت کی خاطر پیچھے اختیار کی گئی۔ اور اگر یہ واقعہ شروع سے ٹھہر چکا تھا۔ تو آفرینش کا تمام کام اس کا محکوم رہا ہوگا۔ اور بائبل سے ظاہر ہے۔ کہ اسی کے ذریعہ سے آفرینش عالم کی کارروائی تکمیل کو پہنچی۔ نہ صرف نجات یافتہ بنی آدم بلکہ ارض وسما کی تمام اشیا اس کے تابع کی گئیں۔ ایسا عظیم الشان واقعہ (بقول اس خیال کے حامیوں کے) بعد کا خیال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ خدا کے ازلی ارادہ آفرینش میں شامل ہوگا۔

ہماری رائے میں اس مسئلہ کے غور و فکر کے وقت بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے۔ کہ ہم اس امر کو مد نظر نہیں رکھتے۔ اور نہ اس کی حقیقی اہمیت

کو سمجھتے ہیں۔ کہ ہم خدا کی تجویز میں اپنی عقل سے چاہے جتنی صورتیں تفریق و امتیاز کی پیدا کریں۔ لیکن اس کی تجویز فی الواقع ایک ہی ہے۔ پس جو تفاوت اور تخالف ہے وہ ہماری ہی سمجھ کے پھیر سے ہے ہم انسانی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ آفرینش عالم کی ایک ایسی تجویز خدا کے دل میں تھی جس سے گناہ خارج تھا۔ لیکن جب بعد ازاں گناہ کا امکان اور احتمال نظر آیا۔ تو ابتدائی تجویز میں ردو بدل کی ضرورت پیش آئی + لیکن اگر ہم اس سے بھی زیادہ وسیع خیال کو جگہ دیں۔ تو ہم مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچیں گے۔ کہ عالم کی تجویز ایک ہی ہے۔ جس میں گناہ کے دخل کا خیال اور اجازت ابتدا ہی سے داخل ہیں۔ یہ بات گو سخت سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ہے ایسی کہ اس سے کیلون اور ارمنی کے پیرو گریز نہیں کر سکتے یہ ہم سب مانتے ہیں کہ گناہ انسان کی فعل مختاری کی وجہ سے دنیا میں آیا۔ مگر یہ امر واقعی ہے۔ کہ گناہ دنیا میں موجود ہے۔ اور الہی ارادہ میں اس کا امکان ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اور خدا نے اسے نظام عالم میں داخل ہونے دیا۔ گویا الہی تدبیر میں اس کے وجود کی اجازت تھی۔ اور نجات کے وسیلے میں اس کا اخراج و علاج بھی مشمول تھا۔ کسی گذشتہ لکچر میں ہم نے ذکر کیا تھا۔ کہ آدم کے گرنے سے پہلے فطرت میں انسان کے گناہ کی پیشگوئی تھی۔ اور کہ اس کے انتظام فطرت میں جو پیچیدگیاں اور دشواریاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی توجیہ صرف اسی قیاس کے وسیلے سے ممکن ہے۔ ہمیں ذرا بالغ نظری سے کام لینا چاہئے۔ اس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ اس معیار سے ہم خدا کی کامل تجویز کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس امر پر بحث کرنا فضول ہے۔ کہ اگر گناہ نہ ہوتا۔ تو نظام آفرینش میں تجسم شامل ہوتا یا نہ ہوتا؟ اگر ابتدائی تدبیر مختلف طور کی ہوتی۔ تو سب باتیں مختلف ہوتیں۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خدا نے ایک ایسا عالم بنایا جس میں گناہ کے دخل کا امکان پیشتر ہی سے دیکھا گیا تھا۔ اور تجسم ایسے

نظام عالم کا ایک جزو تھا۔ اب جب ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر یہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ کہ تجسم آفرینش عالم کی تجویز کا مرکز ہے۔ حاصل کلام یہ کہ خدا کی تجویز واحد اور لا تغیر ہے اور مسیح وہ برہ ہے جو بنائے عالم سے ذبح کیا گیا۔ اور یوں تمام نظام عالم نجات کو ملحوظ رکھ کر مرتب ہوا*

ہماری رائے میں ہمیں اس انجام اور مقصد کو بہت اعلیٰ جگہ دینی چاہئے۔ جو اس خیال کے متعلق کلام الہی میں منکشف ہوا ہے۔ دیکھئے کلام میں اس بات کا صاف ذکر آتا ہے کہ مسیح میں سب چیزیں بلکہ ایک ہو جائینگی۔ کہ اس میں جو سر ہے سب چیزوں کا مجموعہ ہو جائے گا خواہ وہ آسمانوں کی ہوں خواہ زمین کی (افسی ۱: ۱۰) اب سوال برپا ہوتا ہے کہ کیا خلقت کی چیزوں کا یہ مجموعہ جو مسیح میں انجام پانے والا ہے ایک خارجی امر ہے جو خدا کی ازلی تدبیر میں داخل نہ تھا اور جس کی نسبت اُس کے اصل ارادے کچھ اور ہی تھے؟ یا کیا یہ شروع ہی سے اُس کی تجویز میں داخل تھا؟ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ خدا کی تجویز میں کسی واقعہ کا انجام وہی ہوتا ہے جو اس کے آغاز کا فیصلہ کرتا ہے یا یوں کہو کہ۔ جو کچھ کسی شے کو انجام کار ہونا ہوتا ہے وہ اس کی ابتدا پر منحصر ہوتا ہے۔ پس اس شے یا واقعہ کو اُس کے اصل انجام سے ہٹا دینا اور اُس کے ساتھ ایک نیا انجام لگا دینا گویا اس کی اصلی نیچر کے برعکس کرنا ہے۔ پر اگر عام باتوں میں ایسا ہوا کرتا ہے تو یقیناً اس سے کہیں زیادہ یہ اصول اس حالت میں راست آئے گا جب کہ انجام سے مراد خلقت کا انجام ہے اور تجویز زیر بحث سے وہ تجویز مراد ہے جو مجسم بیٹے میں سب چیزوں کو ملا کر ایک کر دینے سے علاقہ رکھتی ہے۔ اب اگر یہ انجام خلقت کی اصل تجویز کا حصہ نہیں تو کیا۔ بعد میں خارجی طور پر اصل تجویز کے ساتھ ملحق کیا گیا تھا؟ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر اس بات کا کیا حل ہے کہ ساری چیزیں اسی (مسیح) کے وسیلے سے اور اسی کے واسطے پیدا ہوئی

ہیں"۔ جس قدر زیادہ ہم ان باتوں پر غور کرتے ہیں اسی قدر زیادہ یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جو رشتہ مسیح اس عالم سے رکھتا ہے وہ ایسا نہیں ہے جو خدا نے بعد میں قایم کیا تھا۔ بلکہ وہ اصلی اور ازلی ہے۔ اور اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کے تجسم کا تعلق عالم کی پوری تجویز کے ساتھ ہے نہ کہ محض گناہ کے ساتھ ؛

ڈاکٹر فیربرن صاحب خود اس بات کو قبول کر لیتے ہیں۔ جب وہ یہ فرماتے ہیں۔ کہ "اس کی آنکھ کے سامنے جو انجام کو شروع ہی سے دیکھ لیتا ہے۔ اور جس کا مقصد ہمہ خلقت کی کامل تجویز کے ابتدا سے بھی پہلے تکمیل کو پہنچا ہوا تھا۔ ہاں اس کی آنکھ کے سامنے موجودات کے کام کا کوئی حصہ پیچھے سے سوچ میں نہیں آیا"۔ اب اس کا کیا مطلب ہے؟ یہی کہ تجسم کو صرف انسان کے گر جانے کے ساتھ مربوط نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ آفرینش عالم کی تجویز بھی شروع ہی سے تجسم سے علاقہ رکھتی ہے اور کہ اس علاقہ کا مقصد یہ ہے کہ گناہ سے نجات حاصل ہو اور انسانیت کمال کو پہنچے۔ مگر اب جب ہم اس خیال کو مدنظر رکھ کر نوشتوں پر غور کرتے ہیں تو وہ ہمیں اس خیال کی تائید کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کی باتوں سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے ؛

(۱) نوشتے خدا کے ایک ہی مقصد کی خبر دیتے ہیں جو کبھی ٹکڑوں میں منقسم نہیں ہوا اور وہ وہ ازلی مقصد ہے جو اس نے مسیح یسوع میں سوچا اور جس میں خلقت اور نجات دونوں شامل ہیں ؛

(۲) ہم نے دیکھ لیا ہے کہ نوشتے ظاہر کرتے ہیں کہ بیٹا خلقت کے کام کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتا ہے (یوحنا ۱: ۳ و اقرنتی ۸: ۶ و کلسی ۱: ۱۵-۱۸ و عبرانی ۱: ۲)۔ واضح ہو کہ یہ خیال کہ ان مقامات میں تو تواریخی مسیح کا ذکر ہے جو ایمانداروں کو نجات دیتا اور گناہوں کی معافی بخشتا ہے تو ہرگز ہرگز ان مقامات کی معنی خیز صفت کو دور نہیں کرتا بلکہ

اُسے اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ کیونکہ ان مقاموں کا اصل مطلب بھی یہی ہے کہ ان دو باتوں کو یعنی خلقت اور نجات کو قریب قریب لائیں اور پھر یہ دکھائیں کہ دونوں خدا کی ایک ہی تجویز کے حصّے ہیں *

(۳) اس سے بھی زیادہ پر مطلب یہ بات ہے کہ مقامات مذکورہ بالا میں مسیح نہ صرف خلقت کا پیدا کرنے والا نظر آتا ہے۔ بلکہ اس کا مرجع یا علت غائی بھی وہی دکھائی دیتا ہے۔ "ساری چیزیں اسی کے وسیلے سے اور اُسی کے واسطے پیدا ہوئی ہیں"۔ "وہ الفا اور امگہ۔ اول اور آخر ہے"۔ اسی طرح وہ مقامات بھی اسی بات پر دلالت کرتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ ایک بادشاہت ہے جو ایمانداروں کے لئے بنائے عالم کے وقت سے تیار کی گئی ہے۔ متی ۲۵: ۳۴۔ کہ برہ بنائے عالم کے وقت سے قتل ہوا ہے"۔ (مکاشفات ۱۳: ۸) اور کہ مسیح بنائے عالم کے پیشتر سے تھا"۔ وغیرہ (۱ پطرس ۱: ۲۰)

(۴) پھر ایسے صاف صاف بیانات بھی پائے جاتے ہیں (اور وہ اقتباس بھی ہو چکے ہیں) جن سے ایک انجام مترشح ہوتا ہے جس کی طرف خدا کا مقصد رہنموں ہے۔ ہم یہاں بشپ لائٹ فٹ کے وہ کلمات پیش کرتے ہیں جو اُن کے قلم سے الفاظ "اسی کے واسطے پیدا ہوئے ہیں" کی تشریح میں نکلے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ "تمام چیزوں کو آخرکار اسی میں مل جانا چاہئے جس سے وہ برآمد ہوئی تھیں۔ یعنی کلمہ میں جو بہ حیثیت درمیانی ہونے کے اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور پھر حکم کے وسیلے اُنہیں باپ میں بھی مل جانا چاہئے جو کہ تمام اشیا کا پہلا منبع ہے۔ اس موجودہ نظام عالم کا یہ آخری انجام بائبل کے کئی مقامات میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً رومی ۸: ۱۹ وغیرہ میں اس کو خلقت کو دردزہ کی پیڑ اور مسیح میں اس کا چھٹکارا کہا ہے۔ اور بعض وقت اس کو تمام خلقت کا پورے پورے طور پر مسیح کا تابع ہو جانا کہا ہے (۱ قرنتی ۱۵: ۲۰) بعض

اوقات اس کو تمام چیزوں کا ہیل (کلسی ۱: ۲۰) اور بعض وقت ساری چیزوں کا مجموعہ کہا ہے (افسی ۱: ۱۰)۔ اس آخری مقام میں جو تصور پایا جاتا ہے وہ (کلسی ۱: ۱۶) کے آخری جملہ کی حقیقت کو خوب واضح کرتا ہے۔ پر بات یہ ہے کہ سارے مقامات ایک ہی صداقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر مختلف صورتوں میں۔ اور وہ یہ کہ ازلی وابدی حکم جس طرح تمام اشیا کا منبع ہے۔ اسی طرح تمام اشیاء کا انجام بھی ہے کہ جس طرح تمام سلسلہ موجوات ایک سے شروع ہوا اسی طرح اُس کو ایک ہی پر منتہی ہونا چاہئے۔ اور کہ اس یکتائی کا مرکز مسیح ہے۔

اب ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ یہ سوال کرنا کہ اگر گناہ نہ ہوتا تو تجسم ہوتا؟ خام خیالی پر مبنی ہے۔ کیونکہ بنائے عالم کے پیشتر ہی سے خدا کی ایک ہی تجویز ہے اور اس تجویز میں گناہ کے دخل کی اجازت اور اُس سے نجات بخشنے کی تدبیر شامل ہیں۔ پس مسیح کا تجسم اس تجویز کا گویا ایک اصلی اور ضروری حصہ ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کا یعنی تجسم کا اصل تعلق نجات کے ساتھ ہے۔ تاہم وہ وسیع تر مطالب بھی رکھتا ہے مثلاً خلقت کے انتظام کو کمال تک پہنچانا بھی اسی کا کام ہے۔ پس وہ نہ صرف انسانیت ہی کو بلکہ تمام دنیا کو اس کے انجام کی طرف لئے جا رہا ہے۔

علاوہ بریں ہم ایک اور نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں اور وہ ایسا نتیجہ ہے جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مسیحی مذہب دنیا اور نجات کی نسبت جو تصور رکھتا ہے وہ ایک ہی ہے۔ یعنی اگر ہم اس تصور کے متعلق جو مسیحی مذہب خلقت کی نسبت رکھتا ہے یہ سمجھ لیں کہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تمام چیزیں مل کر مسیح میں ایک ہو جائیں گی۔ تو اس سے مسیح کی شخصیت پر بڑی روشنی پڑے گی۔ یعنی ہم دیکھیں گے کہ جس طرح ہم اس سے انسانیت منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح الوہیت بھی منسوب کر سکتے ہیں۔ کیونکہ سوائے الہی ہستی کے اور کونسی ہستی اس قابل ہے

لیکن نوشتے یہ رتبہ مسیح کو یک زبان منسوب کرتے ہیں۔ نیز اس سے وہ باتیں بھی واضح ہو جاتی ہیں جو ہم پہلے کسی باب میں انسان کے رتبہ اور خلقت کی ترقی کے قانون کی نسبت عرض کر چکے ہیں جس پر خدا کے کام گواہی دے رہے ہیں۔ جس طرح ہستی کی ادنیٰ منازل انسان میں کمال کو پہنچتی ہیں۔ انسان میں جو زمینی مخلوقات کا سرا اور سردار ہے اور فطرت اور روح کے طبقوں کے درمیان پہلی کڑی اسی طرح انسانیت کی تمام منازل اس مسیح میں کمال کو پہنچتی ہیں جو اپنی شخصیت میں بحیثیت خدا اور انسان ہونے کے خلقت اور خدا کو باہم ملا دیتا ہے ؂

مسیح کے تجسم اور آفرینش عالم کے درمیان جو باہمی علاقہ پایا جاتا ہے۔ اُس کی نسبت ہم خواہ کچھ ہی کہیں ایک بات بالکل صاف ہے اور وہ یہ کہ بائیبل میں تجسم کا تعلق خاص طور پر گناہ یا یوں کہو کہ نجات کے ساتھ نظر آتا ہے۔ چنانچہ یوحنا رسول فرماتا ہے "وہ ظاہر ہوا تاکہ ہمارے گناہوں کو اُٹھا لے جائے اور اس میں گناہ نہیں (۱ یوحنا ۳: ۵) یہی گواہی نئے عہد نامہ کے تمام مصنفوں کی ہے۔ پس اظہر ہے کہ مسیحی مذہب بالتخصیص نجات کا مذہب ہے۔ ہاں وہ انسان کو گناہ کے جرم اور غلبہ سے رہا کرنے کا مذہب ہے۔ وہ انسان کو خدا سے ملانے اور اس کا دوست بنانے اور خدا کی رحمت کے زیر سایہ لا کر پاکیزگی اور مبارک حالی کی دولت سے مالامال کرنے کا مذہب ہے۔ غرضیکہ مسیحی مذہب انسان کو اس کے حقیقی انجام اور کمال تک پہنچانے کا مذہب ہے ؂

پس ہم ان تمام دعووں کو جو مسیحی مذہب کے بانی کو فقط ایک بڑا دینی اُستاد۔ یا راست بازی کی منادی کرنے والا سمجھتے ہیں۔ یا دین اور سوسائٹی کا مصلح تصور کرتے ہیں۔ یا بنی آدم کا ایسا ہی خواہ گردانتے

ہیں جو محض انسان کے جسم اور جان کی فکر کرتا تھا۔ مسیحی مذہب کی حقیقت کے برخلاف سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ اور نہ ہم ان بیانوں کو کافی سمجھتے ہیں جن کے مطابق مسیح انسانیت کا فقط ایک نیا روحانی سر مانا جاتا ہے تاکہ وہ پُرانی خلقت کو کمال تک پہنچائے۔ ہمارے نزدیک مسیح میں یہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ اور اَور بہت کچھ بھی پایا جاتا ہے جس کا اندازہ انسان کے وہم سے باہر ہے۔ خدا کو جو مقصد خلقت کی پیدائش سے مدنظر تھا وہ اب تک قایم ہے۔ اور خدا چاہتا ہے کہ اس کو پورا کرے۔ لیکن انسان کی حالت ایسی ہے کہ خدا کا یہ مقصد محض انسان کی نجات کے وسیلے پورا ہو سکتا ہے اور مسیح اس نجات کے کام کو انجام دینے کے لئے اس دنیا میں آیا *

بعض اوقات مسیح کے مذہب کا مقابلہ اس خصوص میں بودھ مذہب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایک طرح نجات کا مذہب ہے۔ لیکن اس مقابلہ سے دین مسیحی کی خوبی اور جدت اور بھی روشن ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بودھ مذہب کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر ہستی میں دُکھ اور تکلیف ذاتی طور پر موجود ہیں اور جو نجات بودھ مذہب دینے کا وعدہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان پہلے آواگون کی جونوں کے سلسلۂ غیر متناہی سے گذرے اور پھر فنا کے ابدی آرام اور سلامتی میں داخل ہو۔ لیکن مسیحی مذہب کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ خدا نے ہر چیز کو شروع میں اچھا بنایا اور دنیا کی خرابی ناواجب اور غیر مناسب نافرماں برداری سے پیدا ہوئی ہے۔ پس اس دین کے مطابق انسان گناہ سے موزوں وسایل کی وساطت سے نجات پا سکتا ہے اور اس نجات میں نہ صرف گناہ سے رہائی پانا شامل ہے بلکہ یہ بھی شامل ہے کہ انسان خدا کی اس صورت کو جسے اس نے گناہ کے سبب کھو دیا ہے پھر حاصل کرے۔ اور ابدی خوشی میں داخل ہو *

ساری بحث اُس تعلق پر ہے جو نجات مسیح کی شخصیت اور کام کے ساتھ رکھتی ہے معلق ہے۔ اور اس پر غور کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے نجات کے تنگ خیال سے بچنا چاہئے یعنی ایسے خیال سے جس کے سبب سے مسیح کا نجات بخش کام صرف اس کے اُس کرنے اور ہنے پر منتہی ہو جاتا ہے جسے ہم کفارہ کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ مسیح کے جو مقاصد اس دنیا میں آنے سے وابستہ ہیں وہ گناہ کے کفارہ پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کلیسیا مسیح سے بہ حیثیت نجات دہندہ ہونے کے تین عہدے منسوب کرتی ہے۔ یعنی جس طرح وہ اس سے کاہن کا عہدہ منسوب کرتی ہے اسی طرح نبی اور بادشاہ کا عہدہ بھی منسوب کرتی ہے۔ تو یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔ اب ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ بحث زیادہ تر اسی بات پر ہے کہ نجات کا مسیح کے کام اور دُکھ کے ساتھ کیا تعلق ہے اور یہاں ہم بالخصوص اسی بات کی طرف متوجہ ہونگے۔

۱۔ واضح ہو کہ یہ بات تو ثبوت کی محتاج ہی نہیں کہ نئے عہد نامہ کے تمام مصنف جو اس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں گناہوں کی معافی اور بنی آدم کی نجات کو خاص طور پر مسیح کی موت کے ساتھ مربوط کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ وہ ایسا اس واسطے کرتے ہیں کہ وہ اس کی موت کو بمنزلہ قربانی کے مانتے ہیں۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اس صداقت کو شاعرانہ یا مجازی صورت میں پیش نہیں کرتے۔ بلکہ ایسے پکے اور راسخ اعتقاد کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو صاف صاف کہہ رہا ہے کہ انہوں نے نجات مسیح کے مصلوب ہونے سے پائی ہے اور اسی کی بدولت خدا کے ساتھ میل حاصل کیا ہے۔ شاید وہ سب اس بات کا کہ مسیح کی صلیب سے یہ مخلصی کیونکر وقوع میں آتی ہے مفصل بیان نہیں

کرتے۔ لیکن پولوس ایک تھیالوجی اس مضمون پر رکھتا ہے۔ جو بتاتی ہے کہ مسیح کے مصلوب ہونے سے نجات کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ باقی مصنف جو کچھ اس امر پر کہتے ہیں وہ اس کے بیان سے مطابقت رکھتا ہے۔ یعنی وہ بھی مسیح کے خون سے قربانی کے اوصاف منسوب کرتے ہیں۔ اگر کلام کی تشریح بے ریائی اور بے تعصبی سے کی جائے اور بائبل کی تمام تھیالوجی (علم الٰہی) پر توجہ سے غور کیا جائے تو جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ صحیح ثابت ہوگا۔

بعض وقت لوگوں نے عجیب عجیب قسم کے خیال پیش کئے ہیں۔ مثلاً ہولسٹن صاحب کے گمان کے مطابق مسیح کا جسم بمنزلہ گناہ کے ہے اور اُس کے جسم کا گھائل کیا جانا بمنزلہ گناہ کے گھائل کئے جانے کے ہے۔ لیکن اگر ہم اس قسم کے خیالات کو بالائے طاق رکھ دیں تو ہم دیکھینگے کہ نئے عہد نامہ کے خطوط میں نجات کے کام کے متعلق جو الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں وہ اُن بیانوں سے کچھ فرق نہیں رکھتے جو ہمارے علم الٰہی کی کتابوں میں موجود ہیں۔ تمام مفسر خواہ وہ موافق ہوں یا مخالف بہرکیف اس بات پر متفق ہیں کہ نجات کے متعلق پولوس جو تعلیم دیتا ہے وہ وہی ہے جو بالعموم مروج ہے۔ اور یہی بات دیگر مصنفین پر صادق آتی ہے یعنی عبرانیوں کے خط اور پطرس کے خطوط اور مکاشفات اور یوحنا کے خطوط سے بھی یہی شہادت ملتی ہے۔ باوجودیکہ مختلف مصنف مختلف پہلوؤں سے اس تعلیم کو پیش کرتے ہیں اور اُن کے بیان کرنے کے ڈھنگ بھی مختلف ہیں۔ تاہم سب لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ یہی تعلیم دیتے ہیں کہ گناہ کے جرم کی سزا اور اس کی طاقت سے مخلصی مسیح کے وسیلے ملتی ہے اور کہ وہ سب اس کی موت سے قربانی کے اوصاف منسوب کرتے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر مارٹینو صاحب اس تعلیم کو چوتھی انجیل سے منسوب نہیں کرنا چاہتے

اس لئے وہ تمام امکانوں اور شہادتوں کو نظر انداز کر کے یہ مانتے ہیں کہ چوتھی انجیل کا مصنف یوحنا کے پہلے خط کا مصنف نہیں تھا۔

لیکن اس بحث نے جو نئی صورت اختیار کی ہے وہ بڑی غور طلب ہے۔ اور اس سے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ بڑے زور شور سے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً پوچھا جاتا ہے کہ کیا مسیح نے خود بھی اس قسم کی تعلیم دی تھی یا نہیں؟ خطوط میں تو کفارہ کی تعلیم ملتی ہے لیکن کیا خود مسیح کے الفاظ اور اقوال سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے؟ معترض دریافت کرتا ہے کہ کیا وہ انجیل جس کی منادی مسیح کیا کرتا تھا پولوس کی انجیل سے جو کہ علم الٰہی کی تعلیموں سے بھری ہوئی ہے زیادہ سادہ اور سہل نہ تھی؟ اور اسی طرح کیا اُس کی انجیل عبرانیوں کے خط کی تعلیم سے آسان نہ تھی؟ کیا وہ کفارہ کی شکل اور بھاری تعلیم سے بالکل آزاد نہیں ہے؟ کیا پہاڑی وعظ یا مسرف کی تمثیل میں بھی اس کا کوئی نشان پایا جاتا ہے؟ کیا یہ تعلیم بعد میں پیدا نہیں ہوئی؟ اور کیا یہ تعلیم خداوند مسیح کے الٰہی خیالوں کو اور ان باتوں کو جو اُس کی زندگی اور موت سے اُن کے دل پر نقش ہوئیں۔ یہودیوں کی قربانیوں کی تعلیم کے ساتھ خلط ملط کرنے سے پیدا نہیں ہوئی حالانکہ دونوں میں کسی طرح کا رشتہ نہیں پایا جاتا تھا؟ اور کیا اس قسم کے خلط ملط نے مسیح کے سادہ اور الٰہی خیالوں کو آنے والی پشتوں کی نظر سے غائب نہیں کر دیا؟

اگر بات ایسی ہی ہو جیسی کہ معترض بیان کرتے ہیں تو واقعی ہمارے لئے بڑے خطرناک نتایج پیدا ہوں گے۔ کیونکہ اگر مسیح کے رسولوں نے (جن کو اُس نے اسی غرض سے چنا تھا کہ اس کی تعلیم کو دنیا کے حوالہ کریں اور جن کے ساتھ اس نے روح پاک کی ہدایت اور نور کا وعدہ کیا تھا) اسی اہم تعلیم پر اس کے مطلب کو نہ سمجھا بلکہ

اس کی تعلیم کی صحت کا ستیاناس کر دیا تو پھر کہئے کہ ہم اور کون سی بات میں جو وہ مسیح کے متعلق بیان کرتے ہیں ان کا اعتبار کر سکتے ہیں؟ ڈاکٹر ڈنل صاحب نے اپنی کتاب درباره کفارہ میں اس معاملہ پر ایسی مدلل بحث کی ہے کہ ہمیں اور کچھ لکھنے کی ضرورت نظر نہیں آتی اس کو پڑھ لینا کافی ہے۔ ہمارا یہ فرض نہیں۔ بلکہ معترض کا فرض ہے کہ وہ ہمیں بتائے کہ یہ کس طرح ہوا کہ رسولوں اور دیگر قدیم ہادیوں نے مسیح کی تعلیم کو بالکل بدل دیا اور تبدیلی بھی اُن باتوں میں واقع ہوئی جو اُن کے اُستاد کی تعلیم کی بنیادی باتیں تھیں؟ پر سوال برپا ہوتا ہے کہ کیا یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے ایسا کیا؟ کیونکہ یہ دعویٰ اس بات سے تو ہرگز ثابت نہیں ہوتا تو مسیح کی باتوں میں یہ تعلیم ایسی وضاحت سے نظر نہیں آتی جیسی کہ رسولوں کے بیانوں میں اظہر ہے۔ لہٰذا اس نے کبھی دی ہی نہیں تھی۔ انجیلوں میں کئی باتیں جو مسیح کو اس کی تعلیم کا مرکز ٹھیراتی ہیں روز روشن کی طرح چمک رہی ہیں۔ جو صداقتیں اس نے بیان فرمائیں وہ اُسی کو اپنا محور بناتی ہیں۔ اس نے لوگوں کو صاف صاف طور پر بتایا کہ تم فقط مجھ ہی پر ایمان لانے سے بادشاہت میں داخل ہو سکتے ہو۔ اس نے فرمایا کہ جو روحانی طور پر بھوکے اور پیاسے ہیں ان کی بھوک اور پیاس کو میں ہی آسودہ کروں گا۔ اور لوگوں کا انصاف اس رشتے کے مطابق ہوگا جو وہ مجھ سے رکھتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی اور باتیں اناجیل کی سطح پر ستاروں کی طرح چمک رہی ہیں۔ لیکن جو باتیں اس کی موت اور قیامت سے پہلے کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں اُن کی منادی اس سے طلب کرنا گویا ہم سے وہ کچھ منوانا ہے جو ہم از روے عقل سلیم کسی طرح مان نہیں سکتے۔ کیونکہ کفارہ کی منادی سے پہلے کفارہ کا واقع ہونا ضرور تھا۔

تو بھی ہم اتنا ماننے کو تیار ہیں اور ہم مانتے بھی ہیں کہ اگر رسولوں کے بیان مسیح کی تعلیم کو صحیح طور پر بیان کرتے ہیں تو یہ لازمی امر ہے کہ ان کا بیج مسیح کے اقوال اور افعال میں موجود ہو۔ یعنی اس بارہ میں مسیح کی باتیں ایسی ہونی چاہئیں کہ رسولوں کے بیانات اُن کی شرح معلوم ہوں۔ واضح ہو کہ اس قسم کی بہت سی باتیں موجود ہیں۔ اور ان سے وہی تعلیم مترشح ہوتی ہے۔ جو رسولوں کے بیان سے صادر ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو یہ بھید کبھی نہ کھلتا کہ کفارہ کی تعلیم کس طرح پیدا ہوئی +

یہ ایک نہایت توجہ طلب بات ہے کہ جو لوگ مسیحی مذہب کی ذرا بھی رعایت نہیں کرنا چاہتے وہ بھی اس زمانہ میں مسیح کی تعلیم پر غور کرتے ہوئے اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسیح نے اپنی موت سے ایک قسم کی نجات بخش تاثیر منسوب کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ گناہ کی معافی اُسی سے صادر ہوتی ہے۔ رٹشل بھی تصدیق کرتا ہے کہ پہلے مسیح اور پھر اس کے سب سے قدیم شاگرد نجات یا گناہوں کی معافی کو اُس کے نبوی عہدے کے ساتھ مربوط نہیں کرتے بلکہ گناہوں کی معافی کا تعلق زیادہ تر اس کی موت کے ساتھ بتاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر اناجیل کی ساری گواہی پر غور کیا جائے تو اس بات کی تائید بڑے زور و شور سے ہوگی۔ اور پھر یہ عجیب بات ہے کہ یوحنا کی انجیل میں جو چاروں اناجیل میں گویا سب سے زیادہ روحانی ہے۔ ہم کو وہ سب سے قدیم اور صاف اقوال دستیاب ہوتے ہیں جن سے مسیح کی موت اور دنیا کی نجات میں ایک گہرا ربط ظاہر ہوتا ہے۔ ہماری مراد ایسے مقامات سے ہے جیسے بپتسمہ دینے والے کی یہ شہادت "دیکھو خدا کا برہ جو جہان کے گناہ اُٹھا لے جاتا ہے (یوحنا ۱: ۲۹) اور پھر مسیح کے الفاظ جو اس نے نقودیمس کی طرف مخاطب ہو کر اپنی زبان مبارک سے نکالے غور کے لائق ہیں۔ "جس طرح موسیٰ نے سانپ کو بیابان میں اونچے پر چڑھایا۔ اسی طرح ضرور

ہے کہ ابن آدم بھی اونچے پر چڑھایا جائے" (یوحنا ۳: ۱۴ و ۱۵)۔ اور اسی طرح وہ اقوال جو باب ۶ میں درج ہیں اور جن میں اس نے فرمایا کہ میں اپنا گوشت دنیا کی زندگی کے لئے دیتا ہوں (دیکھو آیات ۵۱-۵۶) تک باقی تین انجیلوں کو اگر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ شروع شروع میں ایسے الفاظ خداوند کی زبان حقایق ترجمان سے نکلے جن میں صلیب کا عکس موجود ہے ہماری مراد اس کلام سے جس میں اُس نے برائیوں کے دوزہ رکھنے کے وقت کا ذکر کیا ہے (دیکھو متی ۹: ۱۵) لیکن زیادہ صاف طور پر خداوند نے اپنے دُکھوں اور موت کا ذکر کرنا پطرس کے اقرار کے بعد شروع کیا۔ (دیکھو مرقس ۸: ۳۱ و ۹: ۱۲ و ۳۱ و ۱۰: ۳۳ و ۳۴) پطرس کے اقرار کے بعد اُس نے اپنی موت کی ضرورت کو ظاہر کیا اور ذیل کے الفاظ جو اُس کی موت کی حقیقت پر خاص روشنی ڈالتے ہیں اپنی زبان سے نکالے۔ "کیونکہ ابن آدم بھی اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیے میں دے" (مرقس ۱۰: ۴۵) اس پہاڑ پر جہاں اُس کی صورت تبدیل ہوئی اُس کی موت ہی کا جو یروشلیم میں واقع ہونے کو تھی ذکر ہوتا تھا۔ (لوقا ۹: ۳۱) لیکن سب سے زیادہ واضح اور لائح کلام جو اس بارے میں اس کی موت سے پہلے اُس کے لب پر آیا وہ اُن الفاظ میں قلمبند ہے جو عشائے ربانی کی سکرامنٹ کے قایم کرتے وقت بڑی سنجیدگی کے ساتھ اُس کے منہ سے نکلے۔ چنانچہ اس نے سکرامنٹ کی روٹی اور وائن لے کر فرمایا۔ "یہ عہد کا میرا وہ خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے۔ (متی ۲۶: ۲۶-۲۸)

پھر ان باتوں پر وہ ہدایات اور احکام ایزاد کرو جو رسولوں نے خداوند سے مردوں میں سے جی اُٹھنے کے بعد پائے۔ ہم پڑھتے ہیں کہ ایک خاص موقعہ پر اُس نے شاگردوں کو فرمایا "اے نادانو اور نبیوں کی

ساری باتوں کے ماننے میں سُست اعتقادو۔ کیا مسیح کو یہ دُکھ اُٹھا کر اپنے جلال میں داخل ہونا ضرور نہ تھا؟ پھر موسیٰ سے اور سب نبیوں سے شروع کر کے سارے نوشتوں میں جتنی باتیں اس کے حق میں لکھی ہوئی ہیں وہ اُن کو سمجھا دیں" (لوقا ۲۴: ۲۵-۲۷) اور پھر اُس کے بعد ایک اور موقعہ پر اُس نے گیارہ کو فرمایا "یہ میری وہ باتیں ہیں جو میں نے تم سے اُس وقت کہی تھیں جب تمہارے ساتھ تھا۔ کہ ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توریت اور نبیوں کے صحیفوں اور زبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں۔ پھر اُس نے اُن کا ذہن کھولا تا کہ کتاب مقدس کو سمجھیں اور اُن سے کہا یوں لکھا ہے کہ مسیح دُکھ اُٹھائے گا اور تیسرے دن مردوں میں سے جی اُٹھے گا۔ اور یروشلیم سے شروع کر کے ساری قوموں میں توبہ اور گناہوں کی معافی کی منادی اُس کے نام سے کی جائے گی" (لوقا ۲۴: ۴۴-۴۷) اب یہ مقام جو ہم اوپر ہدیہ ناظرین کر چکے ہیں نہایت ہی بیش قیمت ہیں کیونکہ ان سے عیاں ہے کہ رسولوں کے بیان کی صفائی اور پختگی مسیح ہی کے کلام معجز نظام سے پیدا ہوئی ہے۔ البتہ ہم یہ نہیں جانتے کہ مسیح نے جو بڑی بڑی تشریحیں خدا کے کلام کا مطلب سمجھانے کے لئے پیش کیں وہ کیا تھیں۔ مگر ہم اتنا یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن سے اُس کی موت کا مطلب شاگردوں پر کافی و وافی طور پر کھل گیا ہوگا۔ اور اس بات کے جاننے کے لئے کہ اُس نے اُن کو کیا سکھایا ہم شاگردوں ہی کے اُس کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اُنہوں نے روح کی ہدایت سے تحریر کیا ؛

پس رسولی کلیسیا نجات کی تعلیم کے بیان کرنے میں اسی طرح ہدایت ایزدی سے مالا مال تھی جس طرح کہ وہ مسیح کی شخصیت کی تعلیم کے بیان کرنے میں تھی۔ اُس کے پاس بہت سی حقیقتیں اور وقایع موجود تھے جس سے وہ ایک خاص نتیجہ تک پہنچ سکتی تھی ؛

(الف) اول کلیسیا کے سامنے مسیح کی موت اور قیامت اور صعود کے

واقعات موجود تھے۔ اور چونکہ وہ یسوع کی مسیحائی اور اُس کی الٰہی ابنیت کی قایل تھی اس لئے اس کے نزدیک اس کی موت ایک تاریک اور لاینحل سا معاملہ رہتی اگر اس مشکل کا حل اُس کو نہ ملتا اور وہ یہ کہ اس نجات کے لئے جو مسیح دینے آیا تھا اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ معافی کے لئے اپنی جان دے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسیح کے اس حکم پر بھی غور کرنا چاہئے کہ گناہوں کی معافی ساری قوموں میں اس کے نام سے کی جائے گی اور ان سب کی تہ میں اس کی زمینی زندگی کے تمام واقعات موجود تھے جن سے ایک طرف اس کی قدرت اور فضل کا جلوہ نمودار تھا اور دوسری جانب اُس کی عجیب پستی اور غم ٹپک رہے تھے ؞

(۲) مسیح کے مرقومہ بالا اقوال موجود تھے اور اُن سے دو باتیں بخوبی ظاہر ہو رہی تھیں۔ ایک بات تو اُن سے یہ ظاہر ہوتی تھی کہ نجات کے لئے مسیح کی موت اور دکھوں کی بڑی ضرورت ہے اور دوسری بات جو اُن سے منکشف ہوتی تھی وہ اُس کی موت اور دُکھوں کا مطلب تھا۔ علاوہ بریں جب کلیسیا کو روح القدس کا نور حاصل ہوا تو اس کے کلام کا مطلب اور بھی زیادہ واضح ہو گیا۔ غرضیکہ مسیح کے اقوال پر غور کرنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ مسیح کی موت کے متعلق کلیسیا کا عقیدہ جیسا کہ اب مانا جاتا ہے کیونکر پیدا ہوا ؞

(۳) علاوہ مسیح کے کلام کے قدیم کلیسیا کے پاس وہ الہامی کلام بھی موجود تھا جو نئے عہد نامہ سے پہلے دیا گیا تھا۔ اور جس سے نیا عہد نامہ ایک نہایت گہرا تعلق رکھتا تھا۔ اس کی نسبت مسیح نے خود اپنے شاگردوں کو ہدایت کی تھی کہ تم اگر میری ہستی کی حقیقت سے واقف ہوا چاہتے ہو تو پُرانے عہد نامہ کو پڑھا کرو۔ پس اُس پُرانے مکاشفہ نے بھی مسیح کی موت اور دُکھوں کا مطلب کھولنے میں اُن کی بہت مدد کی ہوگی۔ اس کے متعلق ذیل کی باتیں توجہ طلب ہیں +

(الف) اُن کے پاس پُرانے عہدنامہ کی پیشین گوئیاں تھیں خصوصاً وہ عجیب نبوت جو "خداوند کے بندے" کے متعلق یسعیاہ نبی کی کتاب کے ۵۳ باب میں پائی جاتی ہے جس کے مطابق خدا کے بندے کو ایسی اذیتیں اُٹھانی پڑیں جو کسی طرح اس کا حق نہ تھیں ۔ تاہم اس نے اُن کو بڑی اطاعت اور فرمانبرداری سے قبول کیا ۔ ان اذیتوں اور دُکھوں کے ساتھ اُس نبوت میں کفارہ یا قربانی کی خاصیت منسوب کی گئی ہے ۔ پروفیسر جے ۔ اے سمتھ صاحب فرماتے ہیں کہ "کوئی مفسر ایسا نہیں جو اس بات پر متفق نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ کہ سب لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس نبوت کے مطابق خدا کا بندہ یا خدا خود اپنے بندے کی زندگی کو بطور گناہ کے فدیہ کے یعنی خدا کی شریعت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے قربان کر رہا ہے" ۔

(ب) علاوہ بریں انسان کے دل میں وہ شریعت جو پُرانے عہدنامہ میں ثبت ہے اپنا کام کر رہی تھی ۔ یعنی اس کے دل میں گناہ کی پہچان پیدا کر رہی تھی اور یوں اس کام کے وسیلے سے اُس کے اندر نجات کی ضرورت کا احساس برپا کر رہی تھی ۔ پولوس کی تعلیم اسی بات پر معلّق ہے ۔ چنانچہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی شریعت انسان پر پہلے تو اس بات کو روشن کرتی ہے کہ تو راستباز نہیں ہے ۔ اور پھر یہ امر واضح کرتی ہے کہ تجھکو نجات کی ضرورت ہے ۔

(ج) علاوہ بریں قدیم کلیسیا کے پاس پُرانے عہدنامہ کی قربانیوں کا دستور موجود تھا ۔ یہ بھی ایک کلید تھی جس سے مسیح کی موت کا عقدہ بہت درجہ تک کھل گیا ۔ شریعت نے تو گناہ کی پہچان عطا کی اور قربانی کے دستور نے فدیہ یا کفارہ کے خیال کو روشن کر دیا ۔ عبرانیوں کا خط خاص طور پر اسی مضمون پر تحریر کیا گیا ہے ۔ اب یہ دیکھ کر سوال برپا ہوتا ہے کہ کیا قربانیوں کا دستور اسی واسطے خدا نے مقرر نہیں فرمایا تھا کہ اُس سے اُس سچی اور حقیقی قربانی کا راز جس کے وسیلے سے جہان کا گناہ دور ہونے والا تھا روشن ہو جائے ۔

(۲) ہمیں امید ہے کہ ناظرین نے اب دیکھ لیا ہے کہ رسول یہی تعلیم دیتے تھے کہ نجات مسیح کی موت کے وسیلے سے ہے۔ لیکن فقط اتنا مان لینے سے کہ رسولوں کے بیان اور مسیح کے بیان میں کسی طرح کا تخالف اس امر کے متعلق نہیں پایا جاتا تمام مشکلات حل نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ ہم کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ ہم ابھی دائرہ بحث میں داخل ہی ہوئے ہیں۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کفارہ کی تعلیم بائبل کی آیات میں بنی بنائی مل جاتی ہے۔ اُنہیں جان لینا چاہئے کہ کلیسیا نے آسانی سے اس تعلیم کو نہیں مانا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اس تعلیم نے وہ صورت اختیار کی جو اب نظر آتی ہے۔ کیونکہ صرف یہی سوال حل نہیں کرنا تھا کہ مسیح کی موت ایک قربانی ہے یا نہیں ہے بلکہ اس بات کا فیصلہ بھی کرنا تھا کہ کس معنی میں قربانی ہے۔ کہ وہ ہمارے گناہوں کا فدیہ تو ہے۔ لیکن اس میں وہ کونسی خاصیتیں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے وہ فدیہ کا کام کرتی ہے؟ بے شک وہ گناہوں کی معافی کے ساتھ مربوط ہے۔ لیکن اس رابطہ کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ہیں وہ سوال جو جواب کے لئے پیش آتے ہیں۔ اور جن پر اس وقت بھی ویسی ہی بحث ہوتی ہے جیسی قدیم کلیسیا کے درمیان ہوتی تھی اور جن کو ہم بہ سبب اُن مشکلات کے جو اُن سے کفارے کے متعلق پیدا ہوتی ہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اب ہمارا یہ خیال ہے کہ کلیسیا کا یہ کام نہیں ہے کہ کفارہ کو محض ایک صداقت سمجھ کر قبول کرلے اور اُس کے مطلب اور خاصیت کے سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔ ہمارے خیال میں بائبل کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جس کے سمجھنے کی ہمیں کوشش نہیں کرنی چاہئے اور بالخصوص کفارہ کی کی تعلیم تو خدا کے دل کی الفت کا اظہار اور اس کی بے نظیر محبت کا ثبوت بتائی گئی ہے۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ ہم اس تعلیم کے سمجھنے کی کچھ کوشش نہ کریں بلکہ یہ ہمارے دل پر ایک بوجھ کی طرح

پڑی رہے۔ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جو تعلیم سمجھ میں نہیں آتی وہ انسان کے دل میں ہمیشہ قایم نہ رہے گی۔ مابلکہ ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ علم الہی کی ایک فضول سی بات سمجھی جاکر رد کی جائے گی۔ ایک پادری صاحب نے خوب کہا ہے کہ کفارے کو اپنی حقیقت اپنی ہی روشنی میں ظاہر کرنی چاہئے۔ اب ہم یہ مانتے ہیں کہ کفارے کی تعلیم یا صداقت ہماری سمجھ سے بہت بلند اور بالا ہے۔ لہذا جب ہم اس پر غور کرنے لگیں تو ہم یہ سمجھیں کہ ہم گویا مسیحی دین کے قدس الاقداس میں داخل ہوئے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ تعظیم کے ساتھ اس پر غور کیا جائے اُسی قدر تھوڑا ہے۔ کیونکہ کفارے کی تعلیم کے متعلق یہ امر اظہر ہے کہ یہ تعلیم ایسی بلندی ایسی گہرائی۔ ایسا عرض اور ایسا طول رکھتی ہے کہ ہمارا کوئی پیمانہ اس کو ناپ نہیں سکتا اور اسی لئے یہ ضروری امر ہے کہ ہم کفارے کی مختلف تھیوریوں کو سُن کر گھبرا نہ جائیں۔ بلکہ بڑی برداشت سے اُن کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ ہمارے قیاس میں کوئی تھیوری ایسی نہیں ہے۔ جس کو ہم سرتاپا غلط کہہ سکیں۔ اور وجہ یہ ہے کہ اُس میں ضرور صداقت کا کوئی نہ کوئی ایسا عنصر ہوگا۔ جسے اور تھیوریوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ یا بہت درجہ تک پردے کے پیچھے ڈال دیا ہے۔ پس ہمیں چاہئے کہ مختلف تھیوریوں میں غلطی ڈھونڈنے کے عوض ہم یہ حکیمانہ روش اختیار کریں کہ جو سچائیاں اُن سے اپنی اپنی جگہ پر ظاہر ہوتی ہیں اُن کو جمع کر کے اپنے علم کو توسیع دیں +

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں بہت لوگ اُس واقعہ کی جو ہماری نجات کی جان ہے۔ محض روحانی تفسیر کرنا چاہتے ہیں۔ گو اُن میں سے بہت اس کی عدالتی خاصیت کو رد نہیں کرتے کیونکہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ تاہم وہ چاہتے ہیں کہ کفارہ کی تعلیم سے وہ سخت سی قانونی خاصیت دور ہو جائے جو اس وقت ذہن نشین ہوتی ہے جب کہ ہم اُس کو ایک محض خارجی واقعہ تسلیم کرتے اور اُس کے اندرونی روحانی مطالب پر غور نہیں کرتے ہیں۔

وہ چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ اُن روحانی قوانین کے ساتھ مطابقت پیدا کرے جن کے تابع اور دینی مسایل بھی ہیں۔ لہذا وہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ (۱) ایسے روحانی اصول یا قوانین دریافت کئے جائیں جن کے وسیلے سے کفارے کا مطلب خود بخود کھل جائے (۲) ایسے روحانی قوانین دریافت کئے جائیں جو کفارے کو اُس نئی زندگی کے ساتھ مربوط کر دیں جو اُس سے پیدا ہوتی ہے ✣

جو تجویز ہم نے اختیار کی ہے اُس کے مطابق ضرور ہے کہ ہم اس تعلیم پر (کہ کفارہ مسیح کے وسیلے سے ہے) تجسم کے مسئلہ میں سے نظر ڈالیں اس میں بڑا فایدہ ہے۔ کیونکہ جب ہم تجسم پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جس طرح یہ بات اس سے عیاں ہوتی ہے کہ اگر کفارہ کا کام نہ کرنا ہوتا تو مسیح ہماری صورت اختیار نہ کرتا۔ اُسی طرح یہ بات بھی ثابت ہے کہ تجسم بجائے خود خدا اور انسان کے میل کا ایک عہد۔ اور ایک پیش نشان ہے چنانچہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تجسم واقع نہ ہوتا اگر نجات کا امکان یا غرض مد نظر نہ ہوتی۔ اگر بنی آدم ایسے لاعلاج اور بدحال ہوتے کہ اُن کا بچانا ناممکن ہوتا تو انسان کی صورت میں خدا کے نمودار ہونے کی کچھ ضرورت نہ ہوتی پس تجسم گویا دنیا کی نجات کا اعلان ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تجسم خدا اور انسان کے میل کا صرف پیش نشان ہی نہیں بلکہ اس میل کی ایک ایسی خاص منزل ہے کہ باقی اور منازل اسی منزل سے شروع ہوتی ہیں مطلب اس کا یہ ہے کہ تجسم میں خدا اور انسان ایک معنی میں ایک ہو گئے ہیں۔ یا یوں کہو کہ مسیح میں خدا گری ہوئی اور گناہ سے دبی ہوئی انسانیت کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس یگانگت سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کو خدا کی طرف پھیرنے کے لئے اور جن باتوں کی ضرورت ہے وہ بھی ضرور وجود میں آئیں گی۔ اور اس سبب سے کلیسا میں نجات کے متعلق تجسم کی تعلیم پر طرح بہ طرح زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہاج صاحب فرماتے ہیں کہ

"تجسم یعنی الٰہی اور انسانی ذات کا باہم مل جانا بذات خود ایک بڑا بھاری کام نجات کا تھا۔ مسیح ہم کو اپنی ذات اور ہستی کے طفیل سے بچاتا ہے نہ کہ محض اپنے کام کے طفیل سے" اس قسم کے خیالات کا تخم قدیم آبائی تصنیفات میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً آٹھنی اس کی تصنیفات ہیں۔ پھر اس قسم کے خیالات متوسطین اور ریفارمرز کے زمانہ میں بھی برپا ہوئے۔ اور اب اس زمانہ میں اُن کی تشبیہ ہیکل کے پیروؤں کے خیالات میں نظر آتی ہے جو اس یگانگت یا میل کے اندر جو خدا اور انسان کے درمیان مسیح کی شخصیت میں واقع ہوا بنیاد اس عام میل کی دیکھتے ہیں جو خدا اور تمام بنی آدم کے درمیان واقع ہوگا۔ یعنی اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح مسیح میں الٰہی ذات اور انسانی ذات باہم مل گئی ہیں اسی طرح تمام بنی آدم خدا کے ساتھ مل جائیں گے۔ یہ عقیدہ کہ تجسم اور نجات (مخلصی) دونوں ایک ہی بات ہیں زمانہ حال کے علم الٰہی کو اور بھی کئی طرح رنگین کر رہا ہے۔ خیر۔ بات غور طلب یہ ہے کہ اگر ان خیالوں سے مراد یہ ہے کہ نجات سے مراد سوائے تجسم کے اور کچھ نہیں ہے یعنی اگر مطلب یہ ہے کہ تجسم ہی سے مخلصی اور نجات ہے تو یہ خیالات اور تصویریں ناقص ہیں اور جو صداقت ان میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کلمہ کا انسانیت کے ساتھ مسیح کی شخصیت میں مل جانا گویا اصولاً ایک طرح کا میل درمیان خدا اور انسان کے ہے۔ علاوہ بریں یہ میل ایک وسیلہ ہے جو انسانیت میں ایک زندگی داخل کرتا ہے۔ اب یہ تصور تو ایک ایسا تصور ہے جس کے ساتھ یوحنا رسول کا علم الٰہی ایک خاص تعلق رکھتا ہے۔

واضح ہو کہ نجات کے متعلق جتنے خیالات مسیحیوں میں مروج ہیں وہ اس امر پر متفق ہیں کہ عیسائی نجات میں تین باتیں شامل ہیں:

(الف) جرم یا جُرم کا احساس دور ہو جاتا ہے اور خدا کی معافی کی پہچان پیدا ہوتی ہے۔

(ب) انسان کا دل اور مرضی پھر خدا کے دشمن نہیں رہتے۔ اُن کی دشمنی دور

ہو جاتی ہے اور گنہگار انسان مردہ کاموں کو چھوڑ کر سچے اور زندہ خدا کی خدمت شروع کرتا ہے÷

(ج) ایماندار ہمیشہ کی زندگی میں مسیح کی رفاقت حاصل کرتا ہے اور اُس کو یہ پہچان نصیب ہوتی ہے کہ میں خدا کا فرزند ہوں۔ یہ وہ نتیجے ہیں جو مسیح پر ایمان لانے سے براہ راست پیدا ہوتے۔ آگے پھر ان سے دیگر نتایج برآمد ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ ایماندار کا دنیا سے تعلق بدل جاتا ہے۔ کہ وہ پاکیزگی میں بتدریج ترقی کرتا جاتا ہے۔ کہ وہ موت کے وقت روحانی اور جسمانی بدیوں سے مخلصی پاتا اور موت کے بعد ابدیت کے تمام دور میں ان بدیوں سے آزاد رہتا ہے÷

لیکن دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ مرقومہ بالا تین باتوں میں سے اکثر کسی ایک بات پر بہت زور دیدیتے ہیں اور اس سبب سے اُن کے خیالات دوسروں کے خیالات سے بالکل جُدا اور مختلف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

(الف) جو لوگ تیسری بات یعنی مسیح اور ایمانداروں کی باہمی رفاقت پر زور دیتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ مسیح اس اصلی رشتہ کا نمونہ یا مثال ہے جو خدا اور بنی نوع انسان کے درمیان ہونا چاہئے۔ اور وہ اس کی زندگی اور کام کی باقی باتوں یا خصوصیتوں کو اسی ایک بات کے ضمن میں لانے کی کوشش کرتے ہیں÷

(ب) اسی طرح وہ جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسیح میں وہ دشمنی جو انسان خدا سے رکھتا ہے دور ہو جاتی ہے مسیح کے کام کو محض ایک اخلاقی قدرت تصور کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسیح نجات کے لئے خدا کی قدرت ہے اور کہ اس قدرت کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان کے دل کے بھروسہ کی کمی دور ہو جائے اور وہ خدا پر بھروسہ رکھنے لگ جائے اور اُس کا دل توبہ کی طرف مایل ہو۔ بشنل صاحب کے بیان کے مطابق لوگوں کو اُن کے گناہوں سے نکالنا گویا ان کی سزا سے نکالنا ہے"÷

(ج) وہ خیالات جو تیسری بات سے وابستہ ہیں وہ اس خیال پر زور دیتے ہیں کہ مسیح کا کام خدا کی راستی سے علاقہ رکھتا ہے لہذا وہ ایک قربانی ہے*

اب اگر آپ حقیقی اور سچا دعوےٰ قایم کرنا چاہیں تو وہ ہمارے خیال میں وہ ہوگا جو ان تینوں باتوں کے ملانے اور اُن کو ان رشتوں کے مطابق جو کہ وہ از روئے کلام مسیح کی شخصیت اور کام کے ساتھ رکھتی ہیں مرتب کرنے سے پیدا ہوگا*

اب ہم پہلے یہ دیکھیں گے کہ مرقومہ بالا آراؤں سے ہر ایک رائے میں کون کون سے خیالات پائے جاتے ہیں اور پھر یہ دکھائیں گے کہ کیونکر ان تینوں راؤں کے ملنے سے ایک ایسی رائے پیدا ہوتی ہے جو وسیع اور جامع ہے اور نوشتوں کی گواہی سے پوری موافقت رکھتی ہے*

(الف) پہلے وہ رائے غور طلب ہے جس کے سبب سے وہ تمام تھیوریاں پیدا ہوئیں جو رفاقت یا شراکت کے مسئلہ سے علاقہ رکھتی ہیں اور اس قیاس پر مبنی ہیں کہ مسیح جو کامل اور نمونہ کے لایق انسان) ہے بنی نوع انسان کے ساتھ ایک عجیب رشتہ رکھتا ہے جو اُس کے لقب "ابن آدم" سے مترشح ہوتا ہے۔ گویا زور اس یگانگت پر دیا جاتا ہے جو مسیح اور بنی آدم میں بدیں وجہ پائی جاتی ہے کہ مسیح خود ایک کامل انسان ہے۔ پُرانے تھیولوجن عموماً یہ مانا کرتے تھے کہ مسیح کا تعلق بنی آدم کے ساتھ جن کے بچانے کے لئے وہ آیا ہے محض فیڈرل (فرضی اتحاد) یا منصبی ہے لیکن زمانہ حال کے بہت سے لایق اور فاضل تھیولوجن مانتے ہیں کہ مسیح کی یگانگت انسان کے ساتھ محض منصبی نہیں بلکہ حقیقی ہے کیونکہ وہ خود ابن آدم ہے یہ خیال ایک طرح صحیح بھی ہے۔ اس قسم کے خیال کے ماننے والوں میں شلائر مینجر سب سے سر برآوردہ ہیں۔ اس نامور تھیولوجن کے نزدیک نجات سے مراد اُس مخالفت سے چھوٹ جانا ہے جو روح اور جسم

میں پائی جاتی ہے اور یہ مخلصی مسیح کی پاک اور مبارک زندگی میں شریک ہونے سے وجود میں آتی ہے۔ لیکن شلائر میخر صاحب شراکت کے اس خیال کے ساتھ "ریپری زن ٹیشن" (قایم مقام ہونے) کا خیال بھی ملا دیتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ مسیح خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ اور ایماندار جو اس سے باعتبار انسان ہونے کے ایک خاص قسم کی یگانگت رکھتے ہیں اس میں موجود ہیں۔ اور خدا کی محبت کے مورد کیونکہ خدا اُن پر مسیح میں سے نظر کرتا ہے۔ چنانچہ شلائر میخر صاحب فرماتے ہیں۔ "مسیح محض اس سبب سے کہ اُس نے خدا کی مرضی کو کامل طور پر پورا کیا خدا کے حضور ہمارا قایم مقام ہے اور چونکہ اس کی زندگی ہم میں پائی جاتی ہے اس لئے ہم بھی خدا کی مرضی کو پورا کرنے کی تحریک پاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس رشتہ کے سبب سے جو مسیح اور اس کے لوگوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ ایماندار بھی خدا کی نیک مرضی کے مورد بن جاتے ہیں" بادی النظر میں یہ بیان ایسا ظاہر کرتا ہے کہ گویا شلائر میخر صاحب مانتے ہیں کہ مسیح کی راستبازی ایمانداروں سے منسوب کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ خود بھی ایک جگہ یوں فرماتے ہیں لوگ جو عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ مسیح کی راستبازی اس کے ایمانداروں سے محسوب کی جاتی ہے اس کا صحیح مطلب یہی ہے جو ہمارے خیال سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم ذرا غور سے اُن کے بیان پر غور کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا ایماندار کی ابتدائی پاکیزگی میں کامل پاکیزگی کا وہ تخم معائنہ کرتا ہے جو بڑھتے بڑھتے بالآخر کمال کو پہنچ جائے گا۔ اور اس پاکیزگی کا نمونہ مسیح کی کامل پاکیزگی ہے۔ گویا ایماندار سے خدا اس لئے خوش ہے کہ وہ اُس میں وہ پاکیزگی دیکھ رہا ہے جو بڑھتے بڑھتے آخرکار مسیح کی پاکیزگی کی مانند ہو جائے گی۔ لیکن اس طرح راستباز ٹھیرائے جانے سے ہماری قبولیت کی بنیاد مسیح خود نہیں رہتا بلکہ مسیح کی وہ زندگی قبولیت کی بنیاد بن جاتی

ہے جو ہمارے اندر پیدا ہو کر ہم کو پاک بناتی ہے۔ پس اس میل کی جو خدا اور انسان میں بہ سبب مسیح کی موت اور دکھوں کے پیدا ہوتا ہے کچھ حاجت نہ رہی۔ لہٰذا اس کی موت اور اس کے دُکھ اس خیال کے مطابق نجات کے کام میں بہت اعلیٰ جگہ نہیں رکھتے۔ اور اگر پوچھا جائے کیوں وجود میں آئے تو جواب یہ ہے کہ مسیح ایسی دنیا میں آیا جہاں دُکھ گناہ کے سبب سے پایا جاتا ہے اور نیز اس لئے کہ اُس نے ہمارے گناہوں کے سبب ہمارے ساتھ ہمدردی کی۔ چونکہ اس بے گناہ نے ہم گناہگاروں کی خاطر دُکھ اُٹھائے۔ اس لئے اُس نے گویا ہمارے عوض میں دکھ اٹھائے لیکن ہم ان کو کفارہ یا خدا کی عدالت کے تقاضے کو پورا کرنے والے نہیں مان سکتے۔ اُن کا تعلق ہماری نجات سے صرف یہ ہے کہ وہ ہم کو سکھاتے ہیں کہ خارجی دُکھ جو وارد ہوتے ہیں وہ سزا نہیں ہیں۔ مگر خاص کام مسیح کے دکھوں کا یہ ہے کہ وہ ہم پر مسیح کی ثابت قدمی اور محبت کو ظاہر کرتے اور ہم پر ایک قسم کا اخلاقی اثر ڈالتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ شلائر میخر کی رائے کا لب لباب یہ ہے کہ مسیح ہم کو اپنے مارل انفلوئنس (اخلاقی تاثیر) سے بچاتا ہے۔ یعنی اپنی زور آور شخصیت کے وسیلے ہم پر ایسا اثر پیدا کرتا ہے کہ ہم اس کی رفاقت میں آجاتے ہیں۔ وہ ہمارا نجات دہندہ اُس لاثانی اور باقدرت عرفان الٰہی کے سبب سے ہے جو خود اس کو حاصل تھا کیونکہ اس کے اس عرفان کے سبب سے ہمارے اندر بھی خدا کی پہچان ایسے طور پر پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم گناہ پر غالب آنے لگ جاتے ہیں لیکن جب ہم پوچھتے ہیں کہ اس بنا پر جرم کا احساس کس طرح دور ہوتا ہے؟ تو اس کا جواب عجیب صورت میں دیا جاتا ہے چنانچہ شلائر میخر صاحب فرماتے ہیں کہ ایماندار ایک نیا انسان ہے اور نئے انسان میں گناہ کام نہیں کرتا۔ گناہ پرانے آدم یا پرانے انسان کا کام ہے۔ مگر ایماندار کو پرانے انسان سے کچھ واسطہ نہیں لہٰذا اس کو جرم کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

کانٹ بھی کچھ اسی قسم کے خیال کا پابند تھا۔ اور ہمارے زمانہ میں ملپمتیہ بردن کا بھی ایک حصہ اسی خیال کا معتقد ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس خیال یا رائے کے مطابق گناہوں کی معافی کا مسئلہ خاک میں مل جاتا ہے۔ کیونکہ پُرانا انسان تو معافی پاتا نہیں اور نیا گناہ نہیں کرتا۔ پس معافی ان دونوں باتوں کے بیچ بیچ غائب ہو جاتی ہے ؞

(ب) ہم نے دیکھا کہ سلائر میخر صاحب مسیح کے دکھوں کا مطلب اور اُن کی وجہ بیان کرتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے دکھ اس لئے سہے کہ وہ ہم سے بڑی ہمدردی رکھتا تھا۔ اب اسی لفظ ہمدردی سے دوسرے قسم کے خیالوں کی بنیاد قایم ہوتی ہے۔ یہ خیالات مسیح کی قابل نمونہ کاملیت پر اتنا زور نہیں دیتے جتنا اس بات پر دیتے ہیں کہ مسیحیت میں ایسی طاقت پائی جاتی ہے کہ وہ دشمنی جو گنہگار خدا سے رکھتا ہے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ اس خیال کے ماننے والوں میں ڈاکٹر بشنل صاحب سب پر فایق ہیں انہوں نے اس خیال کو اپنی کتاب موسومہ "وائی کیرس سکریفائس" (Vicarious Sacrifice۔ عوضی قربانی) میں خوب دکھایا ہے۔ جس پوائنٹ پر وہ بہت زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمدردانہ محبت کا خاصہ یہی ہے کہ اوروں کے عوض دُکھ اُٹھائے۔ ہم اکثر اوقات مسیح کے کام کا جو اس نے اوروں کے لئے کیا۔ مثلاً گنہگار کی جگہ لینے۔ اُس کے عوض میں دُکھ سہنے اور مارے جانے کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ لیکن بارہا اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا ہم اُس کے کام کو محض اُس کے منصبی پہلو میں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن بشنل صاحب نے اپنی کتاب کے وسیلے جو کہ زندگی کے ہر درجہ اور طبقہ پر نظر ڈالتی اور ہر طبقہ سے دوسروں کی بہتری او بھلائی کے لئے دُکھ اُٹھانے کے اصول کی مثالیں اخذ کرتی ہے۔ ہم پر اس بات کو بخوبی آشکارا کر دیا کہ مسیح کی تکلیفیں حقیقی اور سچی تھیں۔ پس جب ہم ہمدردی کا ذکر کرتے ہیں ہم ایک ایسے دائرہ میں آجاتے ہیں جہاں دوسروں کے

"نہ کوئی ہم میں سے فقط اپنے لئے جیتا ہے اور نہ کوئی فقط اپنے لئے مرتا ہے"۔ پس ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ ہم یا تو ایک دوسرے سے فایدہ اُٹھاتے ہیں یا دکھ اٹھاتے ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بات بھی ہماری طاقت میں ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ہم اپنی رضامندی سے دنیا کی خوشیوں یا غموں میں شامل ہوسکتے اور دوسروں کے بار اُٹھاکر اُن کے بوجھ کو ہلکا کر سکتے ہیں۔ مسیح چونکہ ایک خاص قسم کا رشتہ نسل انسانی سے رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ اصول ایک نہایت اعلیٰ درجہ میں اُس کے کام سے مترشح ہوتا ہے۔ یوں تو ہم محبت کے تمام دائرہ میں (خواہ وہ محبت الٰہی ہو یا انسانی) اس اصول کو کام کرتے دیکھتے ہیں۔ مگر مسیح میں یہ اصول بدرجہ اولیٰ کام کرتا نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف ہماری ذات کو اپنے اوپر لئے ہے۔ بلکہ اپنی ہمدردی کے فعل کے وسیلے اپنے آپ کو ہمارے ساتھ ایک بنا دیتا ہے۔ ہمارے گناہوں اور غموں کو اپنے اوپر لے لیتا ہے اور خدا کے حضور ہمارا قایم مقام ہوکر کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن صرف اس پیرایہ میں نہیں کہ وہ محض ہمارا ایک خارجی اور قانونی ضامن ہے۔ بلکہ ایسے دل کے ساتھ کہ جس میں محبت جوش مارتی ہے۔ واضح ہو کہ صرف اتنی بات کا ماننا کفارہ نہیں ہے اور ہم ذرا آگے چل کر دکھائیں گے کہ کفارہ میں اس سے بہت کچھ زیادہ شامل ہے۔ تو بھی ہم مانتے ہیں۔ کہ کفارہ میں اور خواہ کچھ ہی شامل کیوں نہ ہو یہ بات بھی ضرور اس میں شامل ہے۔ متی کہتا ہے۔ "اُس نے آپ ہماری کمزوریاں لے لیں اور بیماریاں اُٹھالیں" (متی ۸: ۱۷) اور ویسٹکٹ صاحب اس آیت کو اپنی رائے یا خیال کی کلید سمجھتے ہیں "اُس کو سب باتوں میں اپنے بھائیوں کی مانند بننا لازم ہوا تاکہ اُمت کا کفارہ دینے کے واسطے اُن باتوں میں جو خدا سے تعلق رکھتی ہیں ایک رحم دل اور دیانتدار سردار کاہن بنے"۔ *

پس ڈاکٹر اٹنسل صاحب کی رائے کے مطابق مسیح کے دکھوں کی وجہ جو اس نے دوسروں کے عوض میں اُٹھائے، کلید اُس کی ہمدردانہ محبت ہے۔ اگر ہم اس رائے کی نکتہ چینی کرنے لگیں تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا۔ کہ بموجب ڈاکٹر اٹنسل صاحب کے اصول کے محض ہمدردی اس قدر وسیع نہیں ہے کہ اس سے مسیح کے دکھوں کا معما حل ہو سکے۔ یعنی اُن دکھوں کا حل جن کا وہ حق دار نہ تھا محض ایک لفظ "ہمدردی" کے وسیلے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اُس نے کیسے کیسے دکھ سہے اور کس نیت سے سہے اور کیا نتیجہ پیدا کرنے کے لئے سہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نری ہمدردی ان سوالوں کا کافی جواب نہیں دے سکتی۔ ہاں یہ ہم مانتے ہیں کہ مسیح جیسے پاک شخص کی زندگی میں "ہمدردی" بھی اس کے دکھوں کا ایک باعث تھی۔ مگر وہی ایک باعث نہ تھی۔ اُس نے فطرتی اسباب سے دکھ اُٹھایا یعنی وہ بھوکا اور پیاسا ہوا۔ اُس نے دنیا کی بے ایمانی سے دکھ اُٹھایا۔ مخالفوں کے کینہ ور سلوک اور دشمنوں کی ایذاؤں سے اُس نے دکھ اُٹھایا۔ شیطان کی آزمائشوں سے دکھ اُٹھایا اپنے شاگردوں کی بے وفائی سے دکھ اُٹھایا۔ علاوہ بریں اُس کے دکھوں کے وہ بواعث بھی جو زیادہ گہرے اور پر راز ہیں صفائی سے انجیلی بیانوں میں قلمبند ہیں۔ پس یہ دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ ہمدردی اگر ان دکھوں سے کچھ واسطہ رکھتی تھی تو براہ راست نہیں رکھتی تھی۔ پس ان کے حل کے لئے ہمدردی سے بھی کسی بڑے لفظ کی ضرورت ہے۔ مسیح نے اپنی مرضی سے پستی اختیار کی۔ اپنی مرضی سے دکھ اور موت کو قبول کیا تاکہ بنی آدم نجات کے وارث ہوں۔ پر اُس نے یہ سب کچھ محض ہمدردی کے سبب سے نہیں کیا بلکہ اس محبت کے سبب سے جو اپنے آپ کو دوسروں کے لئے قربان کر دیتی ہے۔ پس ہمدردی محبت میں شامل ہے وہ محبت کا ایک جزو ہے۔ وہ کل محبت کے برابر نہیں ہے۔ پس ہمدردی کو محبت

کے برابر سمجھنا غلطی کرنا ہے۔ علاوہ بریں جب ہم یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہمدردی سے یا محبت کے اخلاقی اثر سے وہ پھل پیدا ہو جاتا ہے جو خود کو قربان کرنے سے پیدا ہوتا ہے تو اس وقت بھی ہم غلطی کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خود انکاری کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دوسروں میں بھی خود انکاری پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اُسکے ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ خود انکاری کا پھل بیشتر اس تعلق پر منحصر ہے جو ایک زندگی دوسری زندگی سے رکھتی ہے۔ اور یہ ہم جانتے ہیں کہ سوسائٹی ایک دوسرے سے ایسے طور پر وابستہ ہے کہ اس کا مجموعہ کُل کا حکم رکھتا ہے یعنی جب کوئی شخص واحد یا چند افراد خواہ وہ شہید ہوں۔ خواہ حب الوطنی سے معمور ہوں۔ ایسی خدمات بہم پہنچاتے ہیں۔ جو اوروں کے لئے مفید ہوں یا دوسروں کے لئے اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں تو اس سے وہ لوگ بھی فایدہ اُٹھاتے ہیں جو اُن کی خود انکاری کے اخلاقی اثر سے کبھی بھی براہ راست متاثر نہیں ہوئے تھے ÷

اب ہم اس بحث کے وسیلے ایک اور غور طلب بات تک پہنچ گئے ہیں اور وہ یہ کہ ڈاکٹر بشنل صاحب اس سوال کا کہ وہ کیا مقصد تھا جس کے پورا کرنے کے لئے مسیح نے یہ تمام ناقابل برداشت دُکھ اُٹھائے صاف جواب نہیں دیتے۔ مگر یہ بات بہت ہی غور طلب ہے۔ واقعی ہمدردی یا بے ریا محبت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کے لئے دُکھ اُٹھائے اور طرح طرح کی خود انکاریوں میں مبتلا ہو۔ لیکن خود انکاری اور دُکھ محض ہمدردی کے اظہار کے لئے اختیار نہیں کئے جاتے۔ بلکہ کسی مقصد یا غرض کے پورا کرنے کے لئے۔ ماں اپنی طاقت کو اپنے بیمار بچے کی تیمارداری میں صرف کر دیتی ہے۔ مگر اس امید سے کہ اُس کا ایسا کرنا بچہ کو صحت کی طرف مایل کرے گا۔ نہ اس غرض سے کہ اُس کی ہمدردی ظاہر ہوگی۔ ایک شخص جو حب الانسان سے معمور ہے اپنی زندگی اور زر کو اس بات کی خاطر

جس سے اس کو دلچسپی ہے خرچ کر دیتا ہے۔ مگر اس صرف کا متحمل فقط اس امید سے ہوتا ہے کہ اس کی وہ تجویزیں اور تدبیریں جو اس کے مقصد کو پورا کرنے والی ہیں برآئیں گی۔ اسی طرح اگر ہم یہ سوال کریں کہ مسیح نے جو دکھ اٹھائے وہ کس مقصد یا غرض کی انجام دہی کے لئے تھے؟ تو اس کے جواب میں یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ اپنی ہمدردی دکھانے کو۔ یا لوگوں پر اخلاقی اثر ڈالنے کو۔ کیونکہ ہم پھر یہی سوال کریں گے کہ وہ کونسا کام تھا جس کی انجام دہی کے لئے ایسے دکھوں میں گرفتار ہونا اس کے لئے ضروری ٹھیرا؟ ڈاکٹر بشنل صاحب اس سوال کا کوئی ایسا صاف جواب نہیں دیتے جو ہم کو مسیح کے کام کا ایک نہایت وسیع نظارہ دکھلائے۔ یعنی ہم کو اس کی اس خدمت سے جو اس نے روح اور جسم کے متعلق انجام دی یا اس گواہی سے جو اس نے کلام اور عمل سے باپ پر دی پرے لے جائے اور یوں دکھائے کہ مسیح کے دکھوں کی غرض دور دور تک پہنچتی ہے۔ پر اگر ہم بفرض محال اس کا کام اتنا ہی مان لیں تو تو بھی خدا کی سیرت اور مرضی کا کوئی خاصہ تسلیم کرنا ضرور پڑے گا جس کی وجہ سے مسیح کو اس دنیا میں آنا اور دکھ اٹھانا پڑا۔ لیکن بشنل صاحب کا زور اس بات پر ہے کہ مسیح صرف خدا کی ہمدردی یا محبت ظاہر کرنے کو آیا۔ ان کے خیال کے مطابق خدا میں برے کی طرح اپنے آپ کو قربان کرنے کی صفت ازل سے پائی جاتی ہے۔ مسیح صرف اس صفت کو ظاہر کرنے کو آیا۔ اب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کی قربانی فی نفسہ کفارہ کے کام کو پورا کرنے کا ایک خاص اور ضروری سبب نہیں ہے۔ بلکہ نجات اس کے اخلاقی اثر سے پیدا ہوتی ہے۔

اب اگر یہ بات مان لی جائے تو نتیجہ خواہ نخواہ یہ نکلے گا کہ جو دکھ اوروں کے لئے اٹھائے گئے ان کی نجات بخش تاثیر مسیح کے دکھوں سے کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ صفت تمام روحانی عالم میں پائی جاتی ہے۔ اور ڈاکٹر بشنل صاحب خود بھی یہی دعوے کرتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑا اعتراض

اس دعوے پر یہ ہے کہ نوشتے جو جگہ مسیح کے کام کو دیتے ہیں وہ جگہ یہ دعویٰ مسیح سے چھین لیتا ہے۔ نئے عہدنامہ کے نوشتے صاف شہادت دیتے ہیں کہ مسیح کے دُکھ کفارہ کی خاصیت رکھتے ہیں۔ پس اُن سے اس خاصیت کو دور کر دینا اور یہ کہنا کہ انسان اُن کے فقط اخلاقی اثر سے نجات پاتا ہے گویا کلام کی بین شہادت پر پردہ ڈالنا ہے۔ یہ خیال ایسا ضعیف ہے کہ ڈاکٹر بشنل صاحب کو خود اسے بعد میں تبدیل کرنا پڑا تاکہ کفارہ کا اصل مقصد۔ بخوبی ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب میں جو اُنہوں نے پیچھے تصنیف کی اور جو فارگِونس اینڈ لا (معافی اور شریعت) کے نام سے موسوم ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے میں یہ خیال کرتا تھا کہ مسیح کے کام کی میل پیدا کرنے والی طاقت اپنا اثر محض بنی آدم پر ڈالتی ہے۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ اُس کا اثر خدا پر بھی پڑتا ہے۔ یعنی مسیح کا کام خدا کا تقاضا بھی پورا کرتا ہے۔ اس کتاب میں جو خاص خیال پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا گنہگار سے جو نفرت رکھتا ہے اُس کے دور کرنے کے لئے یا اُس پر غالب آنے کے لئے ضرور تھا کہ فدیہ یا قربانی دی جائے۔ اس پر یہاں تک خامہ فرسائی کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہماری دانست میں اس خیال کو کسی شخص نے اختیار نہیں کیا ہے۔ تاہم یہ کہنا مناسب ہے کہ ڈاکٹر بشنل صاحب کی پہلی کتاب موسومہ "دائی کیریئس سیکریفائس" (دوسرے کے عوض میں قربانی) میں بھی اس بات کی صاف شہادت پائی جاتی ہے کہ کفارہ تقاضائے عدالت کو پورا کرنے کا ایک ضروری اور لابدی سبب ہے۔ اول سے آخر تک صاحب موصوف اس کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ مسیح کے دکھوں کی نجات بخش تاثیر محض اُن کے اخلاقی اثر پر منحصر ہے لیکن آخر میں آکر اپنی دلیل کی ساری عمارت کو ڈھا دیتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی اخلاقی اور روحانی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ "ہمارے خداوند کے دکھوں

کے واقعات میں (اگر ہم بیرونی طور پر اُن کی طرف دیکھیں) کوئی قربانی کوئی چڑھاوا۔ کوئی کفارہ اور کوئی فدیہ دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ فقط یہ ساری قسمت ہوتا ہے کہ وہ اِس اِس طرح جیا اور اِس اِس طرح موا۔ لیکن اگر یہ سوال برپا ہو کہ ہم کس طرح مسیح کی زندگی کے واقعات کو خدا کے ساتھ میل پیدا کرنے کا وسیلہ سمجھیں تو میں نہیں جانتا کہ کس طرح اس سوال کا جواب دیا جائے ہم کس طرح مسیح کی موت کے وسیلے خدا کی قربت میں آئیں؟ ہم اِس کا کیا مطلب سمجھیں اور کس طرح اس کو کام میں لائیں کہ ہم راستباز ٹھیرائے جائیں اور خدا کے ساتھ میل پیدا کریں۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ کچھ کمی رہ گئی ہے۔ اور وہ کمی اس وقت پوری ہوتی ہے جب ہم ان دکھوں کو قربانی کے دُکھ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور خدا۔ انسان یعنی مسیح مصلوب کو اپنی قربانی یا فدیہ قبول کرتے ہیں جس سے ہماری خراب ضمیر صاف کی جاتی اور ہم گناہ کے داغ سے دھوئے اور پاک کئے جاتے ہیں۔ یہ امر اس قدر ضروری ہے کہ اگر ہم مسیح کے دکھوں کو قربانی یا فدیہ نہ سمجھیں تو ہم ان واقعات کو ایسی نظر سے نہیں دیکھ سکتے کہ اُن کے وسیلے سے خدا کے ساتھ میل حاصل کرنے کے متوقع ہوں مسیح پاک ہے خوبصورت ہے اور عجیب ہے اس کی بے ریا محبت ایک نہایت ہی خوبصورت شے ہے اور اس کی معاف کرنے والی برداشت میرے دل کو مسخر کر لیتی ہے اور اس کے دُکھ میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ لیکن تو بھی یہ سوال پیش آتا ہے۔ وہ کس غرض کے لئے ہے؟ اور میرے لئے وہ کیونکر وہ نجات بن سکتا ہے جس کی مجھے ضرورت ہے؟ اس کا جواب ایک ہی لفظ ہے۔ وہ میرا "فدیہ" ہے۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ میرا گناہ اس پر ہے میں اس کو اپنی قربانی تسلیم کرتا۔ میں اس کے وسیلے خدا کے حضور آتا اور اُس کے خون کے وسیلے قدس الاقداس میں داخل ہوتا ہوں" واضح ہو کہ ان الفاظ کی موجودگی میں جو ڈاکٹر بشل صاحب

نے تحریر فرمائے ضرورت نہیں رہتی کہ اس بات کی تردید کی جائے کہ مسیح کی موت اور دُکھ محض اخلاقی تاثیر کے وسیلے کام کرتے ہیں۔ یہ تصویری تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے کیونکہ جب ہم نے دکھا دیا ہے اس سے بیدار ضمیر کی ضرورتیں رفع نہیں ہوتی ہیں اور نہ یہ خیال نوشتوں کے بیان سے مطابقت رکھتا ہے۔ کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ نوشتے مسیح کی موت اور گناہ کی معافی کے درمیان ایک گہرا ربط ظاہر کرتے ہیں:۔

۳۔ قبل اس کے کہ ہم ان عقیدوں کا ذکر کریں جو کفارہ کی حقیقت کے قایل ہیں ہم ایک اور تصویری کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اور وہ اُس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جس میں رتشل صاحب گرفتار ہوے۔ ہم نے دیکھا کہ رتشل صاحب اس سوال کا کہ مسیح کس کام کے لئے دنیا میں آیا خاطر خواہ جواب نہیں دیتے رتشل صاحب جن کی تصویری کا ذکر ہم اس وقت کرنے لگے ہیں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر رتشل صاحب ہمدردی پر زور دیتے ہیں تو رتشل صاحب مسیح کے ووکیشن (vocation) یعنی کام پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی خلقت اور حکومت سے جو مقصد خدا کو مد نظر تھا وہی مسیح نے اپنا مقصد بنایا اور اسی کے پورا کرنے کے لئے وہ جیا اور موا۔ اور اگر پوچھا جائے کہ وہ مقصد کیا تھا تو جواب یہ ہے کہ خدا کی بادشاہت کو یعنی ایک ایسی دینی اور اخلاقی امت کو قائم کرنا اُس کو مد نظر تھا۔ جس کے شرکا خدا اور انسان کی محبت کے رشتوں سے باہم جکڑے ہوئے ہوں۔ اور جو کام وہ کریں محبت کے محرک سے متحرک ہوکر کریں۔ اور کہ وہ مقصد جو تمام مذاہب کو مد نظر ہے اسی امت میں پورا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دنیا پر اخلاقی حکومت چھا جائے۔ رتشل صاحب کی نظر میں اخلاقی حکومت ہمیشہ کی زندگی کا مرادف ہے۔ واضح ہو کہ یہ خیال (تصویری) بھی تسلی بخش نہیں ہے۔

کیونکہ جب سوال کیا جاتا ہے کہ مسیح کیونکر ہمارا نجات دہندہ ہے؟ تو سب سے بڑا جواب یہ ملتا ہے کہ وہ خدا کے فضل اور سچائی کو ظاہر کرنے اور خدا کی بادشاہت کی خبر دینے اور خدا کے مقصد کے پورا کرنے کے واسطے خدا ہونے کے وسیلے سے لوگوں کو اُن کے گناہوں سے پھیرتا اور اس قابل بناتا ہے کہ وہ خدا کے مقصد کو اپنا مقصد بنائیں۔ اس کی شخصیت اس لئے لاثانی شخصیت ہے کہ خدا کی بادشاہت کا اعلیٰ مقصد جو شخصی زندگی میں پورا ہونا چاہئے اسی کے وسیلے پورا ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص وہی کام کرنا چاہے جو مسیح نے کیا تو اسی پر تکیہ کرکے کر سکتا ہے۔ پس صاحب موصوف کے خیال میں مسیح بنی آدم سے وہی رشتہ رکھتا ہے جو وہ شلائر میخر کے خیال کے مطابق رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ خدا کا اصلی محبوب ہے اور اسی میں خدا اُن کو جو اُس کی رفاقت میں شامل ہیں دیکھتا اور پیار کرتا ہے۔ لیکن رفاقت سے مراد یہاں محض اخلاقی مقصد کی یگانگت ہے۔ یعنی مسیح اور ایماندار محض اخلاقی مقاصد کے متعلق ایک ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ رِٹشل صاحب کے خیال کے مطابق مسیح کے دکھوں کا مطلب کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ مسیح کے کام کی وفاداری کا ثبوت ہیں یا اُس نئے رشتہ کی سچائی کی ایک دلیل ہیں جو انسان کو خدا کے ساتھ مسیح میں حاصل ہوتا ہے اور جس کا اظہار اس کی شخصیت سے ہوا۔ پس ظاہر ہے کہ شلائر میخر کے خیال کی طرح رِٹشل صاحب کا خیال بھی یہی ہے کہ مسیح کے دکھ ہم کو محض اپنے اخلاقی اثر سے فایدہ پہنچاتے ہیں۔ پرانے عہدنامہ کی قربانیوں کی نسبت رِٹشل صاحب کا یہ خیال تھا کہ وہ گناہ کے کفارے سے کچھ واسطہ نہیں رکھتی تھیں اور صرف اس خیال سے چڑھائی جاتی تھیں کہ عابد کی وہ دہشت دور ہو جائے جو اس کو مہیب اور قادر خدا کے نزدیک آنے میں محسوس ہوتی تھی۔ اسی طرح مسیح کی موت بھی ہمارے دل سے خدا کی دہشت دور کرتی ہے اور اُس

کے فضل کا بھروسہ ہمارے دلوں میں بھر دیتی ہے ۔ اور جو پوچھا جائے کہ گناہ کے جُرم کی شرح اس خیال کے بموجب کس طرح کی جاتی ہے ؟ تو جواب یہ ملتا ہے کہ جُرم دور نہیں ہوتا ۔ لیکن خدا ہم کو اپنی رفاقت میں لے لیتا ہے اور اپنی بادشاہت کے قایم کرنے کے کام میں شامل کر لیتا ہے اور اس میں ہمارے جرم یا جرم کے احساس سے کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوتا ۔ رٹشل کے نزدیک راستباز ہونا (Justification) اسی کو کہتے ہیں ۔ رٹشل اس خیال کو بہ آسانی اختیار کر سکتا تھا کیونکہ جیسا ہم اوپر کسی جگہ دکھا چکے ہیں جرم اس کے نزدیک حقیقت نفس الامری نہ تھی ۔ اس کی رائے کے بموجب گناہ کا خیال محض ہمارے ذہن میں موجود ہے ۔ خدا کے نزدیک وہ کچھ بھی نہیں ۔ اب اس خیال کے مطابق معافی بھی کچھ چیز نہ ٹھیری ۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سوائے ذہنی تصور اور احساس کی تبدیلی کے اور کوئی صداقت ہے ہی نہیں ۔ یہ خیال بھی نجات کی تدبیر کو بالکل اُلٹ دیتا ہے لہذا ضروری امر یہ ہے کہ گناہ کے جرم کا تصور جیسا کہ نوشتوں سے ظاہر اور صادر ہوتا ہے قایم کیا جائے اور اُن سے استدلال کرنے کا طریقہ بھی بدلا جائے ۔

جن خیالوں کو ہم اب ہدیہ ناظرین کرنے پر ہیں وہ اُن سے جو اوپر قید کتابت میں آ چکے ہیں بہت مختلف ہیں کیونکہ مندرجہ ذیل خیالات کفارہ کی حقیقت کے قایل ہیں ۔ اور اس لحاظ سے وہ نوشتوں کی بین تعلیم کے بہت نزدیک ہیں ۔ چنانچہ وہ مانتے ہیں کہ مسیح کا کام نہ صرف دل پر اخلاقی اثر ڈالتا ہے ۔ بلکہ اس کی بنا پر خدا ہمارے گناہ معاف فرماتا اور ہمیں اپنی رفاقت میں لے لیتا ہے ۔ اب جو سوال اس قسم کے خیالات سے پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کفارہ میں وہ کونسی چیز ہے جس کی بنا پر خدا ایسا کرتا ہے ؟

(۴) پہلا جواب ان خیالوں سے دستیاب ہوتا ہے جن کے مطابق کفارہ کی اصلیت اور حقیقت اس بات پر منحصر معلوم ہوتی ہے کہ مسیح نے اپنی

پاک مرضی کو خدا کے حوالہ کر دیا۔ اس خیال کے مطابق کفارہ کا تصور اس بات پر مبنی ہے کہ انسان کی مرضی پورے پورے طور پر خدا کے سپرد کی جائے مارس صاحب اور اور کئی صاحبان اسی خیال کو مانتے ہیں۔ مرقومہ بالا تھیوریوں کی طرح اِس تھیوری میں بھی یسح تمام بنی آدم کا سر ہے گویا تمام انسانیت اس میں داخل ہے۔ اور یوں وہ تمام انسانوں کا انسان ہو کر ایک ایسی مرضی کی کامل قربانی خدا کے سامنے گذرانتا ہے جو ہر طرح سے اس کی خدمت کے لئے وقف کی گئی ہے۔ مارس صاحب اس خیال کو اس طرح الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ "فرض کیجئے کہ باپ کی مرضی یہ ہے کہ کامل بھلائی وجود میں آئے۔ اور فرض کیجئے کہ بیٹا جو باپ کا ہمتا اور انسان کا مالک ہے فرماں بردار بن کر اس ادنی حالت میں داخل ہوتا ہے جس میں انسان گناہ کر کے پھنس گیا تھا اور وہ یہ اس لئے کرتا ہے کہ ہمارے جسم میں ہو کر باپ کی اس مرضی کو جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا پورا کرے اور یہ بھی فرض کیجئے کہ اس فرماں برداری کے سبب سے یہ انسان (مسیح) باپ کی دائمی خوشنودی کا جو کہ صلیبی موت کے وسیلہ وجود میں آئی باعث ہے۔ فرض کیجئے کہ اس کی موت ایک قربانی ہے۔ ایک ایسی کامل قربانی جس کی مانند اور کوئی قربانی نہیں ہے۔ ایک ایسی قربانی جس میں روح اور جسم پورے پورے طور پر خدا پر تصدق کئے جاتے ہیں۔ کیا یہ اعلےٰ معنی میں کفارہ نہیں ہے۔ کیا اس سے سچی اور بے گناہ انسانیت کی بڑھت ظاہر نہیں ہوتی؟ کیا انسان اُس (مسیح) میں خدا سے میل نہیں حاصل کرتا؟ کیا صلیب وہ نقطہ اتصال نہیں ہے جہاں انسان انسان کے ساتھ اور انسان خدا کے ساتھ وصل پاتا ہے؟" اس خیال کے مطابق جو جو شے مسیح کی قربانی کو قیمتی بناتی ہے وہ اس کا دُکھ نہیں بلکہ اس کی مرضی کی وہ اطاعت ہے جو اُس کے دُکھ میں ظاہر ہوئی۔ جب خدا نے عبرانیوں کے خط کے بموجب ذبیحہ اور ہدیہ کو نہ چاہا۔ اور سوختنی قربانی اور خطا کی

قربانیوں سے راضی نہ ہوا تو تب اس نے (مسیح نے) کہا کہ دیکھ اے خدا میں آتا ہوں۔ کہ تیری مرضی بجا لاؤں۔ تو وہ پہلے کو مٹاتا تاکہ دوسرے کو ثابت کرے۔ اسی مرضی سے ہم یسوع مسیح کے بدن کے ایک بار قربان ہونے کے سبب پاک ہوئے ہیں" (عبرانی ۱۰: ۵-۱۰) مارس صاحب کے خیال کے مطابق گویا مرضی ہی اس طرح تصدیق کر دینا وہ قربانی ہے جس سے خدا خوش ہوتا ہے اور یہی کامل کفارہ ہے۔ انسانیت کا گناہ کیا ہے؟ خدا کی مرضی سے انحراف کرنا۔ صلیب اس انحراف کو دور کر دیتی ہے۔ اس خیال اور پرانے عہد نامہ کی قربانیوں کے درمیان اس طرح تطبیق پیدا کی گئی ہے کہ قربانیوں میں جو اصلی بات ہے وہ ذبیحہ کی موت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا خون ہے کیونکہ زندگی خون میں ہے۔ موت فقط اس خون کے حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ عابد اس خون کو جس میں زندگی ہے اپنے گناہ کے ڈھانپنے (کفارے) کے لئے چڑھاتا ہے۔

واضح ہو کہ وہ گہری روحانی صداقت بالکل صحیح ہے جو اس خیال میں مسیح کی اس قربانی کے متعلق پائی جاتی ہے۔ جو اس نے ہماری نجات کے متعلق ادا کی۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کفارہ کی تعلیم سے اور خواہ کچھ ہی صادر ہو یہ صداقت ضرور مترشح ہوتی ہے۔ اگر مسیح کی موت قربانی ہے۔ تو ہم اس بات پر شک نہیں لا سکتے کہ اس کی قربانی کی جان اس کی پاک مرضی تھی جس میں اس نے بے عیب ہو کے ابدی روح کے وسیلے آپ کو خدا کے سامنے قربانی گذرانا (عبرانی ۹: ۱۴) واقعی خالی دکھوں سے کچھ فایدہ نہ ہوتا۔ دکھوں کو جس بات نے روحانی قیمت بخشی وہ مسیح کی پاک اور پرمحبت مرضی تھی جس سے اس نے دکھوں کی برداشت کی اور جس کے سبب سے اس نے دکھوں میں اپنی مرضی کو باپ کی مرضی کے تابع کر دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کفارہ کا سارا مطلب یہی ہے؟ کیا اس ہی بات میں مسیح کی قربانی کے کل معنی آجاتے ہیں؟ کیا نوشتوں کی پوری گواہی اس بیان میں سما جاتی ہے؟ گویہ خیال

بہت دلپذیر ہے - مگر ہم ہمیشہ اس کو کافی سمجھ کر اس پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہم یہاں اس خیال کا ناکافی ہونا اس بات سے ثابت نہیں کریں گے۔ کہ یہ خیال مرضی کی قربانی پر تو زور دیتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ یہ قربانی کس بات کے لئے اور کس بات میں ہوئی - ہم یہاں اس بات کو پیش کریں گے جس میں اس خیال کا نقص خاص طور پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ نوشتوں کی رو سے مسیح کی قربانی کا خاص تعلق بنی آدم کے گناہ اور جرم سے ہے - یعنی ان میں ظاہر ہوا ہے کہ اس کی قربانی کفارہ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے گناہ کا جرم دور ہوتا ہے - یعنی اس کا تعلق فقط خدا کی حکم دینے والی مرضی ہی سے نہیں بلکہ فتوی دینے والی مرضی سے بھی ہے - پس یہ نہ صرف اس تعلیم کا تقاضہ ہے جو پرانے اور نئے عہدناموں میں خدا کی راستی اور پاکیزگی کی نسبت پائی جاتی ہے - اور نہ صرف اس تعلیم کا تقاضا ہے جو گناہ کے جرم کی نسبت بڑے زور و شور سے نوشتوں میں موجود ہے - بلکہ انسان کی ضمیر بھی جو بیدار ہو گئی ہے اسی بات کی مقتضی ہے کہ اُس کام میں جو مسیح نے خدا کے حضور انسان کے لئے کیا ہے گناہ کا جرم نظرانداز نہ ہوا اور اس معافی میں جس پر اس کی موت کی مہر لگی ہوئی ہے نہ صرف محبت کا بلکہ عدل الٰہی کا تقاضہ بھی پورا ہو۔

۵- اب ہم اُن خیالات کی طرف متوجہ ہوں گے جو نہ صرف اس بات کے قایل ہیں کہ مسیح نے خدا باپ کی مرضی کو پورا کرنے کے لئے اپنی مرضی کو قربان کیا بلکہ اس بات کے بھی قایل ہیں کہ اس کی قربانی اور گناہ کے جرم میں ایک لاینفک تعلق پایا جاتا ہے - جو لوگ اس صداقت کے قائل ہیں اُن کے شمار میں بہت سے لایق اور کلام کے مطابق تفسیر کرنے والے تھیولوجن شامل ہیں - مثلاً ڈارنر - لوتھارٹ - مارٹننزن اور گوڈے صاحب جیسے تھیولوجن - ان لوگوں کے خیالات کی سچائی کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جو خیالات مخالف رخ پر جا رہے ہیں وہ

اور یہ بات بھی ان کے خیالات کی موید ہے کہ اُن لوگوں کو بھی جو کفارے کی حقیقت کے بہت قایل نہیں ایسے محاورے اور جملے استعمال کرنے پڑتے ہیں جن سے کفارہ کا خیال مترشح ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ کئی علماء جو بڑے روحانی مزاج بھی ہیں اس مسئلہ کو کہ ایک کا گناہ دوسرے کے حساب میں یا ایک کی نیکی دوسرے کے حساب میں قبول کی جاسکتی ہے پسند نہیں کرتے بلکہ اس کو ایک قصہ تصور کرتے ہیں جو قانونی تقاضے کے دور کرنے کے واسطے گھڑا گیا ہے۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ مضمون کے اس پہلو کو بھی باطنی رخ سے دیکھیں اور اُسے روحانی قوانین سے مربوط کریں تاکہ اُس کا قبول کرنا انسان کی ضمیر اور دل کے لئے ناممکن نہو*

کفارے کے متعلق خیالات پیش کرتے وقت ہم پہلے اِس جگہ وہ تصیوری قلمبند کرنا چاہتے ہیں جس کے موید ڈاکٹر ایم کیمبل صاحب ہیں۔ صاحب موصوف مسیح کے دکھوں کو گناہ کی سزا نہیں مانتے تاہم کفارے اور گناہ کے باہمی تعلق پر بہت کچھ تحریر کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کے خیال پر غور کریں تو مضمون زیر بحث پر ہم کو بہت سی روشنی دستیاب ہوگی۔ وہ اپنے خیال کو مسیح کے تجسم سے شروع کرتے ہیں کیونکہ اُن کی رائے یہ ہے کہ خدا کا مجسم بیٹا مسیح جو رشتہ بنی آدم سے رکھتا ہے اُسی سے کفارہ کا خیال خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ اور اُن کی یہ رائے ایک طرح بالکل صحیح ہے پھر وہ مسیح کے کام کے دو پہلوؤں میں امتیاز کرتے اور دکھاتے ہیں کہ اس کے کام کا ایک وہ پہلو ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا گنہگار سے کس طرح پیش آتا ہے اور دوسرا وہ پہلو ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کو خدا سے کس طرح پیش آنا چاہئے۔ ہماری رائے میں یہ تفریق بھی صحیح ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اُن کے خیال یا رائے کی خصوصیت کون سی بات میں پائی جاتی ہے؟ ان کی رائے کی خصوصیت اس بات میں ہے کہ وہ یہ نہیں مانتے کہ مسیح گنہگاروں کی سزا اُٹھاتا ہے۔ وہ یہ مانتے

ہیں کہ مسیح اُن کے عوض میں گناہ کا اقرار اور توبہ کرتا ہے۔

واضح ہو کہ اس خیال کے مطابق گناہوں کی توبہ اور گناہوں کے اقرار کے درمیان ایک قسم کی گڈمڈ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خیال کہ مسیح انسان کا قایم مقام ہو کر بنی آدم کے گناہوں کے لئے کامل توبہ کر سکتا ہے یا کامل توبہ خدا کے حضور لا سکتا ہے تسلیم کے لایق نہیں۔ کیونکہ اول تو ہم کیمبل صاحب کی یہی بات نہیں مان سکتے کہ نری توبہ کفارہ کے برابر ہو سکتی ہے اور اگر مان بھی لیں تو دیگر وجوہات اس خیال کے قبول کرنے کے مانع ہونگے البتہ یہ کہنا کہ وہ گنہگاروں کے عوض میں گناہوں کا اقرار کرتا ہے ناقابل تسلیم نہیں کیونکہ یہ اقرار وہ خدا کے حضور ہمارے لئے کر رہا ہے اور اُس کے اُس کام کا جو وہ ہمارے عوض میں کرتا ہے ایک حصہ ہے۔ موسیٰ دانیل اور نحمیاہ نے بھی اپنی قوم کے گناہوں کا اقرار کیا ہے۔ لہذا ہم اس کو کفارہ کا ایک عنصر تسلیم کرتے ہیں۔ مگر جب ہم صاحب موصوف کے ان الفاظ اور جملوں کو جو وہ عوضی توبہ کی نسبت تحریر کرتے ہیں چھوڑ کر بات کے اصل مغز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جب مسیح نے ایک طرف یہ دیکھا کہ انسان کا گناہ کیا ہے اور دوسری طرف یہ معائنہ کیا کہ خدا اُس گناہ کو کس نظر سے دیکھتا اور کس سزا کا مستحق سمجھتا ہے تو مسیح کی بے گناہ انسانیت نے خدا کے اُس سچے اور برحق فتوے کے متعلق جو اُس نے گناہ پر دیا ہے "آمین" کہا۔ پس ڈاکٹر ایم کیمبل صاحب کی رائے کے مطابق بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسیح کا تعلق خدا کے غضب کے ساتھ یعنی خدا کے اس منصفانہ فتوے کے ساتھ جو اُس نے گناہ پر دیا ہے کچھ تو ضرور تھا۔ کیمبل صاحب خود اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ "جب ہم مسیح کو خدا کے حضور بنی آدم کے متعلق اپنا کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کی نسبت یہ خیال کرنا چاہئے کہ وہ (یعنی مسیح) خدا کے راست غضب کو جو وہ گناہ کی نسبت رکھتا ہے تسلیم کرتا ہے اور اُس کے تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ اور پھر

ایک اور جگہ اس طرح لکھتے ہیں۔ "آؤ ہم اُس "آمین" پر غور کریں جو مسیح کی انسانیت کی تہ سے اس فتوے کے متعلق جو خدا نے گناہ پر نافذ فرمایا ہے برآمد ہوتی ہے۔ اب یہ "آمین" خدا کے غضب سے جو وہ گناہ کے متعلق رکھتا ہے کیا رشتہ رکھتی ہے؟ اور اس کام میں جو وہ اس غضب کے متعلق انجام دیتا ہے کیا جگہ رکھتی ہے اب میں کہتا ہوں کہ وہ جو خدا کے غضب کو جو گناہ کے برخلاف بھڑک رہا ہے دیکھ کر یہ کہتا ہے "اے خدا تو جو انصاف کرتا ہے راستباز ہے" اس نے بالضرور اپنی جان اور روح یعنی اپنی الٰہی انسانیت کے اندر خدا کے غضب کو اور نیز اس گناہ کو جس پر وہ غضب نازل ہوا محسوس کیا اور پہچانا۔ اور اُس کو یوں پہچان کر اس کے ساتھ مناسبت رکھتا ہوا کامل جواب دیا یعنی وہ جواب جو اس کی الٰہی گہرائیوں سے برآمد ہوتا ہے۔ اور وہ اس کامل جواب کے وسیلے سے اس غضب کو جذب کر لیتا ہے"۔ اب اگر ڈاکٹر ایم کیمبل کی تھیوری میں صرف اتنا ہی ہوتا جو اوپر کے اقتباسوں سے ظاہر ہوتا ہے تو تو بھی ہم یہ کہتے کہ گو وہ خیال جو ان سطور سے مترشح ہوتا ہے نہایت ہی بیش قیمت ہے تاہم وہ کامل سچائی نہیں ہے بلکہ نیم سچائی ہے۔ کیونکہ ان الفاظ سے فقط یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح اس غضب کو جو خدا گناہ کے برخلاف رکھتا ہے ذہنی طور پر یا قیاساً محسوس کرتا ہے گو اُس سے موثر بہت ہوتا ہے۔ کہ گو وہ اُس گناہ کو جو انسان میں پایا جاتا ہے پہچانتا ہے اور اسی طرح اس بات کو بھی کامل طور پر پہچانتا ہے کہ خدا اس گناہ کی نسبت کیا کرنا چاہتا ہے۔ تاہم خود کسی طرح اس غضب کے تجربہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ یا یوں کہیں کہ گناہ کی سزا کے نتیجوں کو شخصی طور پر نہیں اُٹھاتا۔ اور شاید بعضوں کی رائے یہ ہو کہ وہ اُٹھا بھی نہیں سکتا تھا۔ اب اس خیال سے اُس "آمین" کی جو مسیح کی انسانیت سے گناہ کے فتوے کے متعلق برآمد ہوتی ہے اور جس پر کیمبل صاحب بڑا زور دیتے ہیں قیمت بہت کم ہو جاتی ہے۔ ایک مثال لیجئے۔ انسان پر جو آزمائشیں

حادث ہو سکتی ہیں اُن کو اچھی طرح پہچاننا اور اس پہچان کی حالت میں صبر اور استقلال سے زندگی بسر کرنا اور بات ہے۔ لیکن غم اور دُکھ کے عملی تجربہ کی حالت میں صبر کرنا اور راضی برضائے خدا رہنا دیگر بات ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ حقیقی صبر یا برداشت وہی ہے جو آزمائشوں کی بھٹی میں عملی طور پر آزمائی جاتی ہے۔ پس اگر یہ چاہو کہ مسیح کی انسانیت کی "آمین" جو خدا کے اُس فتوے کے متعلق جو وہ گناہ کے اوپر دیتا ہے اپنے معنی میں پوری نکلے تو لازم ہے کہ وہ صرف خدا کے اس غضب کے محض احساس پر جو کہ مسیح گناہ کے متعلق رکھتا ہے مبنی نہ ہو بلکہ خدا کی سزا کے عملی تجربہ کی حالت میں اس کی زبان سے نکلے۔ ہاں وہ ان دکھوں کے تجربہ میں سے خصوصاً اس موت کے تجربہ میں سے اس کی زبان سے برآمد ہو جو خدا گناہ کے سبب سے بنی آدم پر نازل فرماتا ہے۔ کیمبل صاحب کہتے ہیں کہ مسیح کی زندگی کا آخری زمانہ ایسا زمانہ تھا جس کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ مسیح وہ دُکھ سہے جو اسے تاریکی کی ایک ساعت اور طاقت کے متعلق سہنا تھا۔ صاحب موصوف کے خیالات مسیح کی موت کی نسبت ایسے برمحل اور موزوں ہیں کہ ہم اُن میں سے چند ایک اقتباس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "جب میں خداوند مسیح کی موت کی نسبت غور کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہی اکیلا ایسا شخص ہے جس نے حقیقی طور پر موت کا مزا چکھا ہے۔ پس اسی اکیلے نے اس بات کا مطلب سمجھا کہ گناہ کی مزدوری موت ہے۔ کیونکہ جب مسیح اس طرح خدا کی شریعت کی تعظیم اور تکریم کرتا ہے تو اس کے اس عمل میں خدا کی شریعت کا فتوے اور نیز خدا کا منشا جو اس فتوے سے ظاہر ہوتا ہے شامل معلوم ہوتا ہے۔ اگر گناہ فقط بنی آدم کی روحوں میں پایا جاتا جن کا تعلق جسم کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوتا تو گناہ کی سزا موت نہ ہوتی۔ بلکہ الٰہی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے جو کفارہ دیا جاتا اس کے عناصر روحانی ہوتے۔ لیکن چونکہ انسان باعتبار انسانی ساخت کے مرنے کے قابل ہے اور

چونکہ موت گناہ کی مزدوری ہو کر انسان کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہے۔ لہذا کفارے میں نہ صرف گناہ کی رعایت ضروری تھی بلکہ اُس شریعت کی رعایت بھی لازمی تھی جس کے عدول کی سزا موت ہے یعنی وہ موت جس کا فتوے جاری ہو چکا ہے۔ پس نہ صرف خدا کے دل کا خیال کرنا لازمی تھا بلکہ اُس کے دل کے منشا کو بھی پورا کرنا تھا جو اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے موت کو گناہ کی مزدوری ٹھیرایا ہے"۔ اب اس بیان سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ایم کیمبل صاحب کس قدر کفارہ کے اُس تصور کے نزدیک آجاتے ہیں جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسیح جو انسانیت کے دائرہ میں داخل اور بنی نوع انسان کا نیا سر ہے سزا کے وہ دکھ اُٹھائے جو خدا کے اس غضب پر جو وہ دنیا کے گناہ کے متعلق رکھتا ہے شاہد ہیں۔ البتہ صاحب موصوف یہ کہتے ہیں کہ یہ دکھ مسیح کے لئے سزا کی صورت نہیں رکھتے۔ مگر یہ امتیاز محض لفظی ہے کیونکہ خواہ ہم ان الفاظ کی کہ "وہ مسیح نے ہمارے لئے خدا کا غضب اپنے اوپر لے لیا" کچھ ہی تاویل کیوں نہ کریں بہرحال یہ ظاہر ہے کہ کبھی کسی نے ان کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ مسیح شخصی طور پر خدا کے غضب کا نشانہ ہوا۔ مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کے انتظام کے مطابق جو اس نے مقرر کر دیا تھا وہ (یعنی مسیح) ان دکھوں کے تجربہ میں سے گذرا جن سے خدا کا غضب برخلاف گناہ کے ظاہر ہوتا ہے یا وہ فتویٰ روشن ہو جاتا ہے جو بسبب گناہ کے انسانیت پر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایم کیمبل صاحب کے بیان میں جو خیال خاص طور پر مفید بہ تعلق مسیح کے کفارہ والے دکھوں کے پایا جاتا ہے یہ ہے کہ ان دُکھوں کو جس چیز نے گناہ کا کفارہ بنایا وہ مسیح کی وہ برداشت یا صبر نہ تھا جس سے اس نے اُن دکھوں کو بڑی خاموشی اور بردباری سے سہا۔ اور نہ وہ راضی بہ رضا رہنے کی صفت تھی جس کے سبب سے اس نے اپنی مرضی کو باپ کی مرضی کے تابع کر دیا بلکہ وہ کامل پہچان تھی جس سے اُس نے اس بات کو پہچانا کہ جو دکھ خدا نے گناہ کی سزا کے لئے مقرر کئے ہیں اُن کے مقرر کرنے میں وہ پاک اور

راست ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ "خدا کے دل کا ارادہ جو گناہ کے متعلق
تھا اُس "آبین" میں جو مسیح کے دل سے نکلی پورا ہوا اور اسی سے خدا کا
غضب راست طور پر دور ہوتا ہے ہم مانتے ہیں کہ یہ ایک مشکل کام ہے کہ
کوئی اس قسم کی تصیوری تجویز کی جائے جس سے کسی طرح کا گریز نہ ہو سکے
اور جو یہ ظاہر کرے کہ مسیح کے دُکھ جو بہت درجہ تک راستبازی کے سبب
سے اُٹھائے گئے تھے وہ ساتھ ہی کفارہ کے معنے بھی رکھتے تھے۔ تاہم یہ
صاف ظاہر ہے کہ نوشتوں کی تعلیم صریح گواہی دے رہی ہے کہ اُس کے
دُکھ کفارہ کی خاصیت رکھتے ہیں۔ اس راز کے سمجھنے میں ذیل کی باتیں
بہت مدد دیں گی اور وہ یہ ہیں۔ کہ خدا کے بے گناہ بیٹے کے دُکھ اختیاری
تھے۔ یعنی اُس نے جو دُکھ اُٹھائے وہ اپنی مرضی سے اُٹھائے۔ وہ اس کا
لازمی حق نہ تھے۔ (اور یہ بات بنی آدم میں سے کسی اور آدمیوں کے دُکھوں
کی نسبت نہیں کہہ سکتے) کہ جس قدر ایک پاک ہستی ہماری سزا کے دکھوں
کو اُٹھا سکتی تھی اس درجہ تک اُس نے دُکھوں کو اُٹھایا اور آخر کار اُس
نے اس موت کو بھی سہا جو گناہ کی سزا کے طور پر انسانیت پر نازل ہوئی
تھی۔ کہ اُس نے دکھ کو اور موت کو یہ جان کر سہا کہ اُن کا تعلق گناہ کے
ساتھ ہے۔ کہ اُس نے ان دُکھوں کی تلخی کا پورا پورا تجربہ کیا اور اپنی آخری
ساعتوں میں اس قدر دُکھ میں مبتلا ہوا کہ اس کو وہ روحانی تسلی بھی حاصل
نہ ہوئی جو اس کے بہت سے لوگوں کو ایسی حالت میں حاصل ہوا کرتی
ہے۔ کہ اس کے دُکھوں میں ایسے پر راز عناصر موجود تھے جن کی حقیقت کو
بیرونی اسباب وانہیں کر سکتے۔ مثلاً گتسمنے کی جانکنی اور کلوری پر اُس کی
رُوح کا ہیبتناک تاریکی میں ملفوف ہو جانا) اور جو اُس پر اس لئے حادث
ہوئے کہ وہ ہمارا گناہ بردار ہے۔ اور آخری بات یہ کہ اس فنا کرنے والے
غم میں بھی اُس کا رشتہ باپ کے ساتھ قایم رہنا۔ اور وہ ہمارے روحانی دشمنوں
پر فتح پانا۔ اور بنی آدم کے لئے خدا کے تقاضے کو ایسے طور پر پورا کرتا اور ہمارے

ساتھ کامل محبت رکھ کر اپنے آپ کو ایسے طور پر خدا کے حضور گزران دیتا اور گناہ کے فتوے میں اور اُن دُکھوں میں جو بسبب اس فتوے کے اُس پر نازل ہوئے خدا کے انصاف کو ایسا پہچانتا اور اس کی ایسی عزت کرتا ہے کہ اس کی موت نہایت معقول طور پر راستبازی کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ایک قربانی سمجھی گئی جو ہماری اور دنیا کی خاطر چڑھائی گئی۔ یہاں یہ یاد رہے کہ فقط اُنہیں کو فائدہ پہنچتا ہے جو ایمان سے اس کی قربانی کو قبول کرتے اور روح میں اس کی موت میں اس کے ساتھ مرتے اور اسکی راستبازی کو اپنی امید کا لنگر بناتے ہیں *

اب کیا سو سچائی اُن فرقے کے لوگوں کی طرح یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک راستباز شخص مجرموں کے لئے کس طرح دُکھ اُٹھا سکتا ہے؟ اور کیا یہ انصاف ہے کہ ایسا ہو؟ کہ راستباز کی تکلیفیں یا دُکھ کیونکر ناراستوں کا کفارہ ہو سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس سوال میں درحقیقت دو سوال پائے جاتے ہیں۔ پہلے سوال کا تعلق اُن دکھوں کے ساتھ ہے جو راستباز ناراستوں کے لئے سہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسلمہ امر ہے جس پر کسی طرح کی حجت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے واقعات ہمارے عام تجربہ سے روزمرہ گزرتے ہیں اور پھر جب ہم اس رشتہ پر غور کرتے ہیں جس کے وسیلے سے ہم ایک دوسرے کیساتھ جکڑے ہوئے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اس کے سوائے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ بدکرداری کی سزا کبھی بُرا عمل کرنے والے پر محدود نہیں رہتی بلکہ دوسروں تک جا پہنچتی اور اُن کی تباہی کا باعث ہوتی ہے اب اس تجربہ کی نکتہ چینی کر کے یہ کہنا کہ کیوں ایک کی برائی کی سزا دوسروں کو ملتی ہے گویا بنی نوع انسان کی ساخت اور اس کے قوانین پر جرح کرنا ہے۔ ہم اس بات کو مدنظر رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ مسیح اس قانون سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ بلکہ وہ اس قانون کی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مثال ہے۔ مسیح دنیا میں

بغیر اوروں کے دکھوں کا تشدد سے داخل نہیں ہو سکتا تھا اور چونکہ وہ بالکل پاک اور راست تھا اس لئے اُس نے اُن کی شدت کو بہت ہی محسوس کیا۔ اس مضمون پر شبل صاحب جیسے مصنف نے بھی بڑے زور آور الفاظ استعمال کئے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مسیح مجسم ہو کر دنیا کی لعنت میں داخل ہوا۔ کہ خدا کا فتوےٰ اُس پر اسی طرح سے تھا جس طرح بنی آدم پر ہے جن کی نسل میں وہ داخل ہوا۔ اسی طرح وہ بار بار کہتے ہیں کہ وہ ہماری حالت میں جو کہ لعنت کی حالت ہے داخل ہوا۔ کہ وہ ہمارا ہم ذات بنا ہمارا بھائی بنا اور کہ وہ ہمارا بھائی بن نہیں سکتا تھا جب تک کہ اس افسوس ناک خصوصیت کو جس سے کہ ہماری ذات مختص ہے اپنے اوپر نہ لیتا یعنی جس طرح ہم لعنت کے ماتحت ہیں اسی طرح وہ بھی اُس کے ماتحت نہ آتا۔
وہ جانتا تھا کہ یہ لعنت یا سزا کی شرمندگی اور تباہی ہمارے گناہ کا نتیجہ ہے سو یہ جانتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو اس حالت کے سپرد کیا۔ پس ان باتوں سے ظاہر ہے کہ سوال یہ نہیں کہ مسیح جو گناہ سے مبرا ہے مجرموں کے لئے کس طرح دُکھ اُٹھا سکتا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ دُکھ یا سزا جو اس طرح اُٹھائی جاتی ہے کس طرح کفارہ کا کام دے سکتی ہے؟ اس کا جواب اس بات میں پایا جاتا ہے کہ اوّل یہ مسیح ہماری انسانیت کے ساتھ عجیب رشتہ رکھتا ہے۔ لہٰذا اس عجیب رشتہ کے سبب سے وہ بنی نوع انسان کا قایم مقام اور گناہ بردار ہو سکتا ہے دوم اس بات سے یہ معاحل ہو سکتا ہے کہ مسیح نے ہماری انسانیت اختیار کر کے ہمارے گناہوں کے ساتھ ایک عجیب تعلق پیدا کیا یعنی اس نے دکھوں کو نہ صرف صبر سے سہا اور نہ صرف اُنکے سہنے میں اپنی مرضی کو باپ کی مرضی کے تابع کیا بلکہ اس پہچان کے ساتھ سہا کہ وہ اس فتوے کا نتیجہ ہیں جو خدا نے گناہ پر نازل کیا ہے اور یوں ہماری ذات کو اپنے اوپر لیکر اُس نے خدا کے انصاف کو جو ان دکھوں میں جھلک رہا تھا ایک کامل اور جلالی صورت میں پورا کیا۔ اسطرح اُس کے دُکھ خدا کے اس خادم کے دُکھوں کی طرح کفارہ بن گئے جسکا ذکر یسعیاہ ۵۳ ویں باب میں آیا ہے۔

اب اگر ہم مسیح کے کام کی ان مختلف صورتوں کو جو اوپر ہمارے سامنے آئیں ایک جگہ جمع کریں تاہم دیکھیں گے کہ وہ بات جو ہم اوپر کہہ آئے ہیں بالکل صحیح ہے۔ اور وہ یہ کہ مسیح کے نجات کے کام کے وسیع اور صحیح تصور میں وہ تمام باتیں جو اوپر ملاحظہ سے گذریں شامل ہیں۔ ہر تعبیر جس صداقت پر زور دیتی ہے وہ اس میں موجود ہے پس مسیح کے کام کے کامل تصور میں ذیل کی سب باتیں شامل ہیں۔ یعنی اس میں یہ بات شامل ہے کہ مسیح کے تجسم کے وسیلے دائرہ انسانیت میں ایک نئی الٰہی زندگی داخل ہوئی۔ اس میں یہ بات شامل ہے کہ مسیح خدا کے سامنے ہماری طرف سے ایک کامل قایم مقام (ریپریزنٹیٹو) ہے۔ کہ وہ بنی نوع انسان کا [illegible] انسانیت کے جامہ کو پاک اور کامل حالت میں پہنے ہوئے ہے۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ ہر بشر کے ساتھ خاص خاص تعلق رکھتا ہے جس کے سبب سے وہ سچے اور اصلی طور پر ہمارے گناہ اور دکھ کے تجربہ میں داخل ہوا۔ اور ہمارا ہمدرد اور وفادار سردار کاہن بن کر ہم سب کو اپنے دل میں لئے ہوئے خدا کے حضور داخل ہوا۔ اس میں یہ خیال بھی شامل ہے کہ مسیح کا یہ کام تھا کہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت قایم کرے اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی کرے کہ خدا باپ کی سیرت کو ظاہر اور اس کی مرضی کو بنی آدم کے درمیان پورا کرے اور لوگوں کے گناہوں کا کفارہ دے۔ پھر اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مسیح اپنی مرضی کو خدا کے حضور ایک پاک اور کامل لگاتار نذر کے طور پر گذرانتا رہے۔ یعنی ازلی روح کے وسیلے انسانیت میں وہ نذر ادا کرتا رہے جو انسان کو ادا کرنی چاہئے تھی مگر جسے وہ اپنی ناقابلیت کے سبب سے ادا نہ کر سکا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ مسیح انسانیت میں ہو کر خدا کے حضور وہ کامل راستبازی چڑھا رہا ہے جس کی بنا پر انسانیت کا رشتہ خدا کے ساتھ ایک نیا رشتہ بن جاتا ہے اور وہ راستبازی اس پیارے میں مقبول ٹھیرتی ہے۔

پھر یہ آخری بات بھی اس میں شامل ہے۔ کہ گناہ کے جرم کو دور کرنے کے لئے جو کچھ خدا کے حضور کرنا چاہئے تھا سو مسیح نے کر دیا۔ اس معاملہ کے متعلق جو بات یاد رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس نے ہمدردی سے صرف اسی بوجھ کو جو بہ سبب گناہ کے جرم کے ہم پر گرا ہوا ہے نہیں پہچانا۔ اور نہ فقط ہمارے گناہوں کا اقرار ہی ہمارے لئے کیا ہے اور نہ محض اس بات کو محسوس کیا ہے کہ خدا کی راستبازی ہمارے گناہوں پر غضب اور قہر کو نازل کر رہی ہے۔ بلکہ ہمارے لئے یہ بھی کیا کہ درحقیقت سزا اُٹھانے کی حالت میں اپنے آپ کو لے آیا۔ خصوصاً موت کی حالت تک جو کہ وہ اس سزا اُٹھانے کی گویا آخری اور سخت ترین سزا تھی اپنے آپ کو پہنچا دیا۔ تاکہ وہ ان سب باتوں میں ہمارے ساتھ ایک ہو جائے۔ اور ایک ہو کر خدا کے حضور وہ کچھ گذرانے جس کا تقاضا خدا کی عادلانہ راستبازی کر رہی تھی۔ اور وہ کفارا تھا۔ واضح ہو کہ خدا کی عدالت کو پورا کرنے کے خیال کو رسولی تھیالوجی نظرانداز نہیں کرتی بلکہ اس پر زور دیتی اور بتلاتی ہے کہ گناہوں کی معافی اسی بنیاد پر ملتی اور اسی بنیاد پر گناہگار خدا سے میل حاصل کرتا ہے۔ بنین اس بنیاد کی نسبت کہتا ہے کہ خدا اسی کے وسیلے "گنہگار کو راستی سے راستباز ٹھہراتا ہے"۔

مسیح جو خدا کا بیٹا ہے اور ہماری ذات میں مجسم ہوا ہے وہی اس کام کو انجام دینے کے لایق ہے۔ اور اُسی نے ابن اللہ اور ابن آدم ہو کر اس کام کو فی الواقع انجام دیا ہے۔ وہی اکیلا اس لایق تھا کہ ایک طرف دنیا کے گناہ کے مطلب کو ایسے طور پر سمجھے اور دوسری طرف اس بات کو کہ اُس گناہ کے سبب سے خدا کا کیا تقاضا تھا ایسے طور پر سمجھے کہ نہ گناہ کی بدی کم ہو اور نہ راستبازی کی عظمت میں فرق آئے۔ بلکہ دونوں کی حقیقت پورے پورے طور پر ظاہر ہو۔ کہ راستبازی برقرار ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی دنیا کے لئے معاف کرنے والی رحمت کا دروازہ کھل جائے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ اُسی نے

وہ کام کیا جو ہم نہیں کر سکتے تھے۔ وہی خدا کے حضور وہ کچھ لے آیا جو ہم نہیں لا سکتے تھے۔ اُسی نے ٹوٹی ہوئی شریعت کے اُس تقاضے کو پورا کیا جو ہم پورا نہیں کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے اُس راستبازی کو کمال تک پہنچا دیا جو ہم اپنی بنانا چاہتے ہیں۔ اسی نے دنیا پر وہ فتح پائی جس میں ہم حصہ لگانا چاہتے ہیں۔ اسی نے محبت بھری شخصی مرضی کو پیدا کیا جو ہم اپنے میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اسی نے اس سیلف سکریفائیس (خود کی قربانی) کے رونق والے کمال کو درجہ غایت تک پہنچایا جس میں ہم قدم مارنا چاہتے ہیں۔ جب ہم اس قربانی کو جو اس نے ادا کی ہے اپنا بنا لیتے ہیں۔ یعنی نہ صرف اسکی کفارہ وہ نائبیت کے اعتبار سے بلکہ اسکی اندرونی روح کے اعتبار سے اپنا بنا لیتے ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ ہم نے نجات حاصل کی اور ہم خدا سے میل رکھتے ہیں ؛

نواں باب

تجسم اور انسان کا انجام

دنیا کا خواہ کوئی تصور لیں اُس کے ساتھ عاقبت کا خیال ضرور وابستہ پائیں گے۔ جب ہم دنیا پر غور کریں گے اس وقت نہ صرف یہی سوالات برپا ہوں گے کہ دنیا کیا ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ بلکہ یہ سوال بھی ساتھ ہی پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کہاں کو جا رہی ہے"؟ دانیل نے فرشتہ کو کہا "اے میرے خداوند ان چیزوں کا انجام کیا ہوگا"؟ (دانیل ۱۲: ۸) پس سوال برپا ہوتا ہے۔ کہ انسان کا انجام آخر کار کیا ہوگا؟ کیا وہ موت کے وقت فنا ہو جاتا ہے یا ہستی کی کسی اور حالت میں داخل ہوتا ہے؟ اور اگر کسی

اور حالت میں داخل ہوتا ہے تو وہاں خوشی یا غم کی کیسی کیفیتوں میں رہتا ہے؟ کہ اس سارے عظیم الشان سلسلہ کا آخر اور انجام کیا ہوگا؟ وہ خدا کا مقرر کیا ہوا آخری واقعہ کونسا ہے جو ابھی بہت دور ہے مگر جس کی طرف ساری خلقت چلی جارہی ہے؟ بنی نوع انسان کو یہ کہنا کہ تم یہ سوال نہ پوچھو بے فایدہ ہے۔ وہ یہ سوال ضرور کریں گے اور لازم ہے کہ کریں انسان تو ذرا ذرا سی بات کو لیگا شریعت کے ہر ایک سراغ وہ ٹکڑے کو جس سے جواب کی امید ہوگی لیگا اور اس پر غور کرے گا۔ وہ زمانہ ماضی کے تجربہ اور زمانہ حال کے علم کو لے گا اور اس سے نتیجہ نکالے گا کہ آیندہ کو کیا ہوگا۔ وہ ان دیکھے عالم میں جہاں تک دیکھ سکتا ہے دیکھے گا اور جہاں علم ساتھ چھوڑ دے گا وہاں اپنی امیدوں اور اپنے خیالوں سے آیندہ کی تصویریں اپنے لئے کھینچے گا۔

واضح ہو کہ عاقبت یا انجام کے ساتھ علاقہ رکھنے والی باتیں محض مذہب ہی میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ وہ تو فلسفہ اور سائنس میں بھی ہوتی ہیں مثلاً اسطوئیقی فلسفہ کے ماننے والے دنیا کے دوروں کے متعلق یہ مانا کرتے تھے کہ تمام چیزیں آگ سے بھسم ہو جاتی ہیں اور پھر پہلے کی طرح نمودار ہو جاتی ہیں۔ بودھ مت کے ماننے والوں کے یہاں کلپوں کے دوروں میں ہمیشہ کبھی برہمانڈ رچا جانا اور کبھی ناش ہونا اور کبھی پھر رچا جاتا ہے۔ برہمن یا ہندو مت بھی یہی تعلیم دیتا ہے۔ ہارٹ من بھی جو ایک پیسی مسٹ یعنے یہ ماننے والا تھا کہ دنیا تنزل کی طرف جارہی ہے اسی طرح دنیا کے ایک قسم کے انجام کو مانتا تھا جس طرح کہ مسیحی مذہب اپنی تعلیم کے مطابق ایک قسم کے انجام کو مان رہا ہے۔ فلاسفر کانٹ نے اپنے مضمون "دی تھیوری آف دی ہیونس" (Theory of the Heavens) میں عالموں کی پیدائش اور موت پر بحث کی ہے اور اس دنیا کو ان گرم ملکوں کے درختوں سے تشبیہ دیتا ہے جن میں کہیں کلی کا پھول بن جاتا ہے۔

اور کبھی شاخوں پر سے پکا ہؤا پھل زمین پر گر پڑتا ہے۔ اس زمانہ کا سائنس (علم) کس طرح آئندہ کے دائرہ میں جھانکتا اور دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہ ان تمام اشیاء کا انجام بالآخر کیا ہوگا۔ اور اس طبعی یونیورس کے تبدلات و انقلابات۔ عناصر کے جمع اور الگ الگ ہونے کا رُخ کس طرف ہے۔ اور کہ اس زمین اور تمام موجودات طبعی کا کیا انجام ہوگا! مسٹر سپنسر صاحب بھی ایک قسم کے مسئلۂ عاقبت کو مانتے ہیں۔ چنانچہ اُن کا قیاس ہے کہ ایک لامحدود خلا موجود ہے اور اُس میں جا بجا بجھے ہوئے سورج پائے جاتے ہیں جو ہمیشہ تک بجھے رہیں گے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ شاید کسی نہ کسی طرح (گو اُن کو معلوم نہیں کہ کس طرح) اس موجودہ یونیورس کی راکھ میں سے ایک نیا یونیورس پیدا ہوگا۔ کتاب "دی اَن سین یونیورس" (اَن دیکھی دنیا) کے مصنّف کہتے ہیں کہ "جو کچھ ہمارے نظام پر واقع ہوگا وہی تمام دیدنی یونیورس پر واقع ہوگا۔ جو کہ [اگر محدود رہے تو] ایک عرصہ میں بیجان تودے کی مانند بن جائے گا۔ بشرطیکہ بالکل معدوم ہونے کا فتوےٰ اس پر نہ لگے۔ غرضیکہ یونیورس بھی انسان کی طرح بوڑھا اور کمزور ہو جائے گا۔ یہ دیدنی یونیورس واقعی ایک نہایت پُر جلال جامہ ہے مگر وہ غیر فانی نہیں ہے۔ اگر ہم بقا کو پہننا چاہیں تو ہمیں اس بات کی تلاش کسی اَور جگہ کرنی چاہیئے"۔

موجودات کا مسیحی تصوّر بھی ایک قسم کے مسئلۂ عاقبت کو پیش کرتا ہے۔ اور اُس کے طبعی انجاموں کے متعلق پیش کرتا ہے۔ اور وہ انجام اُن انجاموں سے جو ہم ابھی عرض کر چکے ہیں، بہت مختلف نہیں ہے۔ فرق ہے تو یہ ہے کہ آخری انجاموں کی نسبت سائنس کا تصوّر نفی کی صورت رکھتا ہے۔ لیکن مسیحی تصوّر اثبات

کی صورت رکھتا ہے۔ سائنس کا تصور مٹیریل ہے۔ لیکن مسیحی تصور اخلاقی ہے۔ سائنس کا تصور عالموں سے وابستہ ہے۔ لیکن مسیحی تصور انسان سے تعلق رکھتا ہے۔ سائنس کا تصور موت اور وفات میں ختم ہوتا ہے۔ لیکن مسیحی تصور شخصی بقا میں۔ عاقبت یعنی آخری انجام کا یہ تصور جو مسیحی مذہب کے ساتھ وابستہ ہے مسیحی مذہب کی اس خصوصیت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی ایک علت غائی کا قائل ہے۔ دنیا کا سب سے اعلےٰ تصور وہ ہے جو ایک انجام یا مقصد کے وسیلے یعنی اس خیال کے وسیلے کہ دنیا کی ایک علت غائی ہے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دنیا کے مختلف جزویات ایک کُل سے مربوط ہیں۔ اور جب ہم اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ دنیا کی تمام طاقتیں ایک ہیں اور ایک مقصد کو پورا کرنا چاہتی ہیں تو فقط اُس وقت ہم انسان کی زندگی کی یکتائی کو سمجھتے یعنی اس بات کو پہچاننے لگتے ہیں کہ اُس مقصد کو بجالانے کے واسطے انسان بھی اس کامل سلسلے کے ساتھ ایک خاص علاقہ رکھتا ہے۔ لیکن موجودات کے دوروں کے سلسلوں کو مان کر زندگی کے متعلق کوئی تسلی بخش تصور قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی کا ایسا تصور جس سے غرض یا مقصد ٹپکتا ہو اُسی وقت قائم ہوگا جب ہم یہ مانیں گے کہ دنیا کی تمام طاقتیں ملکر ایک خاص مقصد کو پورا کرنے پر کمربستہ ہیں۔ چونکہ مسیحی مذہب اس قسم کے مقصد کو پیش کر رہا ہے اس لئے وہی بالتخصیص ایک علت غائی کو پیش کرنے والا مذہب ہے۔ چنانچہ ڈارنر صاحب فرماتے ہیں کہ محض مسیحی مذہب ہی علت غائی پر زور دینے والا ایک مذہب ہے۔ علاوہ بریں ایک اور بات بھی ہے جس میں مسیحی مذہب سائنٹفک اور دیگر اعلےٰ تصورات سے مطابقت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنی وسعت اور پرواز میں محض اس ارض پر جو ایک نقطہ کی مانند

ہے محدود نہیں رہتا بلکہ اُس سے کہیں دور نکل جاتا اور اپنی تاثیروں کو خلقت کے دور دراز طبقوں تک پہنچا دیتا ہے ۔

قبل اس کے کہ ہم اُن مسائل پر جو کہ عقبےٰ یا آنے والی زندگی کی حقیقتوں سے متعلق ہیں کچھ تحریر کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو بات ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُس اعتراض پر بھی غور کر جائیں جو بعض اوقات مسیحی مذہب پر کیا جاتا ہے چونکہ طرح طرح کی باتوں کے معلوم ہونے اور بالخصوص علم اسٹرانومی کی معلومات کے بڑھ جانے سے ہمارے علم میں بڑی وسعت آ گئی ہے۔ یا یوں کہیں کہ چونکہ دوربین کی طفیل سے عالم موجودات کے قد وقامت کی نسبت ہمارے خیالات بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ اور چونکہ ہم زمین کو بہ سبب اُس مقابلہ کے جو اُس میں اور دیگر اجرام فلکی میں کیا گیا ہے۔ سلسلہ موجودات میں ایک نقطہ کی مانند سمجھنے لگ گئے ہیں اس لئے بعض اشخاص کے نزدیک یہ خیال کہ خدا اس چھوٹی سی دنیا کو بچانے کے لئے فکرمند ہے قابل پذیرائی نہیں۔ چنانچہ سٹراس صاحب نے بڑی دلیری سے یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اس خیال نے کہ زمین متحرک ہے اور سورج کے اردگرد دیگر سیاروں کے ساتھ گھومتی ہے اُس تصور کو سخت صدمہ پہنچایا ہے جو مسیحی مذہب دنیا کی نسبت رکھتا ہے۔ جب تک یہ مانا جاتا تھا کہ زمین اس برہمانڈ کا مرکز ہے اور ذی جان اور ذی عقل مخلوق اس میں پائی جاتی ہے۔ تب تک یہ ماننا بھی ممکن تھا کہ خدا اس دنیا کے باشندوں سے خاص محبت رکھتا ہے اور کہ اُس نے اُن کے بچانے کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا ہے۔ لیکن جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ زمین سورج اور دیگر سیاروں سے کیا علاقہ رکھتی ہے۔ اور مزید برآں جب یہ راز کھل گیا کہ لامحدود آسمان کی سطح پر بے شمار سورج پائے جاتے ہیں

اور جا بجا کہکشاں اور عقد ثریا موجود ہیں اور کہ اُن کے درمیان ہمارا سورج بمعہ اپنے متعلقہ سیاروں کے ایسا ہے جیسے سمندر میں پانی کا قطرہ تو پھر یہ خیال کہ اس کُرّے۔ اس ناچیز سے نقطے کی سٹیج پر وہ عظیم الشان الٰہی ڈراما جس کا ذکر دین عیسوی کرتا ہے واقع ہؤا ناقابل اعتبار معلوم ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ خدا اس بے مقدار دنیا کو خاص طور پر چاہے اور اسے اپنے الہاموں اور انکشافوں سے مالا مال فرمائے اور اس کی نجات کے لئے اپنے بیٹے کو مجسم کر کے اس کی سطح پر فدا ہونے کے لئے بھیجے ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ زمین ایک ایسے یونیورس میں پائی جاتی ہے جو عالموں اور جہانوں سے پُر ہے اور جن میں قیاساً ہر طرز اور درجے کی عقل کے باشندے پائے جاتے ہیں۔ پس خدا کو زمین کے ساتھ جو سب سے چھوٹے سیّاروں میں سے ایک چھوٹا سیّارہ ہے مربوط کرنا دانائی کی بات نہیں ہے۔ یہ اعتراض ہے اور اب ہم اس جواب دیں گے ؛

چونکہ یہ اعتراض سائنس کے نام میں کیا گیا ہے لہٰذا ہم پہلے یہ پوچھتے ہیں۔ کہ جس دعوے پر یہ اعتراض قائم ہے یعنی یہ قیاس کہ بے شمار عالم موجود ہیں جن میں ایسی عقول کے باشندے بستے ہیں جیسی کہ طبقۂ انسانی میں پائی جاتی ہیں کہاں تک سائنس کے ثبوت پر مبنی ہے یا کم از کم کس قدر کسی قابل قدر قیاس پر یہ دعوے قائم ہے؟ مشہور فلاسفر کانٹ صاحب تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس دعوے کی سچائی پر کہ دیگر سیاروں میں سے کم از کم ایک اور سیّارہ بھی ذی جان مخلوقات سے پُر ہے میں اپنا سب کچھ قربان کر دوں بشرطیکہ کسی طرح کے تجربے کی معیار سے اس دعوے کی صداقت ثابت ہو جائے۔ شاید اور لوگ اُن کے ساتھ متفق نہ ہوں۔ تاہم یہ روشن ہے کہ سائنس کوئی صاف گواہی اس امر پر نہیں دیتی۔

اور وہ دلیل جو انالوجی یعنی تشبیہی قیاس پر مبنی ہے۔ وہ زمانۂ حال کی تحقیقات سے تقویت پانے کے عوض ضعف پکڑتی جاتی ہے۔ اگر علم اسٹرانومی نے ہمارے خیالات کو یونیورس کے متعلق در بارۂ خلا توسیع کر دیا ہے۔ تو اسی طرح علم جیالوجی (طبقات الارض) نے زمانۂ ماضی کی نسبت ہمارے خیالات کو ہماری دنیا کے متعلق توسیع بخش دی ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ گو ہزارہا سال سے زمانۂ ماضی میں انسان کی آمد کے لئے تیاری ہو رہی تھی تاہم انسان کا اس دنیا میں نمودار ہونا نہایت ہی جدید واقعہ ہے۔ اور کہ وہ ایسی حالتوں میں نمودار ہوا جن کی نسبت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمارے نظام شمسی کے کسی اور سیارے میں بھی موجود ہیں۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ جس طرح وہ عالم موجود ہیں۔ جو بن چکے ہیں۔ اسی طرح وہ عالم بھی موجود ہوں جو بنتے جاتے ہیں؟ ہمارا نظام شمسی قریباً سات سو اکاون حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ ان میں سے سات سو پچاس حصوں میں ایسی زندگی جیسی کہ ہم کو معلوم ہے یا جیسی کہ ہم قیاس کر سکتے ہیں۔ انہیں پائی جاتی کیونکہ کل کا بہت ہی بڑا حصہ آفتاب نے اپنے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ اور جو حصہ باقی رہ جاتا ہے (یعنی مریخ) اس کے تھوڑے سے جزو میں وہ شرائط اور حالتیں موجود ہیں۔ جنمیں اعلےٰ قسم کی زندگی کا وجود ممکن ہو سکتا ہے۔ اب اگر اس قسم کی حالتیں تمام یونیورس میں موجود ہوں تو وہ حلقہ جس میں عقلی زندگی نمودار ہو سکتی ہے اسی نسبت سے کم ہو جائیگا۔ پر بات اصل یہ ہے کہ ہم ان سیاروں کی نسبت جو کہ آسمان کے دیگر حصص میں پائے جاتے ہیں کچھ نہیں جانتے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ موجود بھی ہیں یا نہیں۔ پس کیا تعجب ہے۔ کہ ہمارا سیارہ ہی سیاروں کے سلسلہ میں باغ عدن ہو۔ کہ وہی ایک ایسی جگہ ہو جہاں عقلی زندگی کے پھول کے کھلنے کی پھلواڑی تیار کی گئی ہو۔ یہ بات عجیب اور غور کے لائق ہے۔ کہ یہ اعتراض جو مسیحی مذہب پر کیا جاتا ہے۔ ان عقلی تصورات پر بھی عائد ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے انیسویں صدی کی گود میں جنم

لیا ہے۔ مثلاً ہیکل کا فلسفہ اور ہارٹن اور دیگر صاحبان کے خیالات اس اعتراض سے آزاد نہیں ہیں۔ کیونکہ انکے فلسفے اور تصورات بھی یہی مانتے ہیں۔ کہ اسی دنیا میں لامحدود اپنے وجود وہستی کی شناخت حاصل کرتا ہے۔ اور ہیگل کے قول کے مطابق اسی دنیا میں خدا انسان میں مجسم ہوتا ہے۔ اگر ہم ان خیالات کو نظرانداز کردیں تو ہم دیکھینگے کہ جو اعتراض مسیحی مذہب پر کیا جاتا ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ وہ محض مقدار کے ساتھ علاقہ رکھتا ہے۔ اور بس۔ طبقہ موجودات کا حجم خواہ کچھ ہی ہو۔ اُس سے اس بات کی سچائی میں سرمو فرق نہیں آتا۔ کہ ہمارے چھوٹے سے سیّارے کی سطح پر زندگی عقل کی کلیو نہیں شگفتہ ہوئی ہے۔ اور کہ یہاں ذی عقل ہستیوں کی ایک نسل پائی جاتی ہے۔ جسمیں خدا کی صورت نظر آتی ہے۔ اور جو خدا کو جاننے اور پیار کرنے اور اُس کی مرضی بجالانے کی لیاقت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اسکے مقابلہ میں بے جان مادے کی مقداروں یعنی بے شمار سورجوں اور سیّاروں کو پیش کرنا محض حماقت ہے۔ اب اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ علاوہ اس عالم کے ہزارہا عالم اور بھی ہیں۔ جنمیں ذی عقل مخلوق موجود ہے۔ تو اس سے انسان کی روح کی قیمت یا قدرومنزلت کم نہیں ہو جاتی۔ انسان کا دماغ اگر ایسی عقلی قوتیں رکھتا ہے۔ جیسی کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ رکھتا ہے۔ تو تو اس کی عظمت میں اس بات سے کہ اور جگہوں میں بھی ایسی قسم کے دماغ پائے جاتے ہیں۔ سرمو فرق نہیں آتا۔ انسان اس بات سے کہ وہی اکیلا اشرف واعلےٰ نہیں ہے۔ اپنی عظمت کے پایہ سے گر نہیں جاتا۔ اگر انسان ایک روحانی ہستی ہے اگر وہ مسیحی دعوے کے مطابق ایسی روح رکھتا ہے۔ جس کی قدروقیمت کی کچھ انتہا نہیں تو اُس کی عظمت اور قدرت ایک ذرّہ کے برابر بھی کم نہ ہوگی خواہ موجودات کا سارا سلسلہ دوسری روحانی ہستیوں سے بھرا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ اور مسیحی مذہب ہمیشہ مانتا آیا ہے۔ کہ اور روحانی ہستیاں بھی اس عالم میں ہیں۔ اب بات یہ ہے۔ کہ جس انتھروپو مارفزم (خدا کا مانندِ انسان ہونا) پر اعتراض

کیا جاتا ہے۔ وہی انتھروپومارفزم خود اس اعتراض کی تہ میں موجود ہے۔ مخالفوں کی رائے یہ ہے۔ کہ اگر انسان ہی اکیلا ذی شان مخلوق ہوتا۔ تو اُس حالت میں انسان کی نسبت فکرمند ہونا خدا کی شان کے مطابق ہونا۔ لیکن دیگر مخلوقات کے ہوتے ہوئے محض انسان کے لئے فکرمند ہونا شان خداوندی کے خلاف ہے۔ یا وہ یہ سوچتے ہیں۔ کہ خدا ایسا بلند اور برتر ہے کہ وہ ایک تنہا مخلوق کو مخلوقات کی بھیڑ میں دیکھ ہی نہیں سکتا جو لوگ اس قسم کے خیالات میں مبتلا ہیں۔ وہ اُس ہستی کی نسبت جسے وہ بڑی بلندی اور رفعت پر پہنچانا چاہتے ہیں ایسے ادنےٰ خیالات رکھتے ہیں جو شان الٰہی کے شایاں نہیں ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سلسلۂ موجودات اُسی وقت قائم رہ سکتا ہے۔ جبکہ خدا ادنیٰ اشیاء میں بھی اُسی طرح موجود ہو۔ جس طرح کہ وہ اعلےٰ اشیاء میں موجود ہے کہ خدا کا علم اور قدرت اور فکر محض بڑے بڑے سورجوں اور مادے کے ٹکڑوں تک منتہی نہیں بلکہ مادے کے ہر ذرہ تک جداگانہ طور پر پہنچتا ہے۔ کہ گھاس کے ہر چھوٹے سے پتے اور اُڑنے والے ہر ننھے سے کرم اور پانی کے مہین سے مہین کیڑے میں بھی جسکو کہ خوردبین سے بھی بمشکل تمام دیکھ سکتے ہیں۔ خدا کے علم اور قدرت اور محبت کا جلال جلوہ نما ہے۔ بائبل ہی کی تعلیم میں یہ سچا فلسفہ ہم کو ملتا ہے۔ کہ جو خدا ستاروں کی خبر لیتا ہے۔ وہی روحوں کی نسبت فکرمند ہے۔ وہ سکھاتی ہے کہ ہمارے سر کے بال بھی گنے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے آسمانی باپ کی مرضی کے بغیر ایک چڑیا بھی زمین پر نہیں گرتی

(دیکھو زبور ۱۴۷: ۳ و ۴ متی ۱۰: ۲۹-۳۱)

لیکن اگر تمام چمکیلے کُرّے انسان جیسی عقلی ہستیوں سے آباد سمجھے جائیں (حالانکہ ایسا ہے ہی نہیں) تو بھی یہ سوال باقی رہتا ہے۔ کہ کیا وہ سب گنہگار ہیں؟ گناہ جو ہولناک مطلب رکھتا ہے۔ اس یونیورس سے محو نہیں سکتا خواہ ایک چھوڑ ہزار دنیا انسان جیسے باشندوں سے معمور ہوں

پر اگر صرف ہماری ہی دنیا گنہگار ہے۔ تو تو بھی یہ خدا کی شان کے عین شایاں ہے کہ وہ اُسے ہلاکت سے بچائے۔ کیا انسان کے دل نے مسیح کی اُس تمثیل کی الوہیت کو جو کھوئی ہوئی بھیڑ کی تلاش کے متعلق ہے نہیں پہچانا۔ کیا کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈھنا اور بچانا ایسا الہٰی کام نہیں جو خدا کی شان کے شایاں ہو۔ فرض کیجئے کہ اس سنسار میں واقعی اتنی ذی عقل ہستیاں موجود ہیں۔ جتنی کہ معترض بتاتا ہے۔ اور کہ اُن میں سے ہماری دنیا مثل بھٹکی ہوئی بھیڑ کے گم گشتہ ہو گئی ہے۔ اب کیا اُس بھٹکی ہوئی دنیا کو ڈھونڈنا اور بچانا نیک چوپان کی شان کے خلاف ہے؟ اور کیا روح کی قیمت ایک ایسی شے ہے۔ جس کا اندازہ میزان اور ترازو سے لگایا جا سکتا ہے۔

مسٹر سپنسر صاحب ایک جگہ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم سچ مچ اس بات کو مانتے ہو کہ اُسی سبب اولی نے جیسکی حد ہمارے خیال کے بموجب نہ خلا اور نہ وقت میں پائی جاتی ہے۔ اور جس کی لامحدود وسعت میں ہمارا انتظام شمسی تل کے برابر بھی جگہ نہیں رکھتا کیا تم ایسے لامحدود سبب اول کی نسبت مانتے ہو کہ اُس نے سور یا (آرام) کے ایک چوپانی سردار کے ساتھ عہد و میثاق قائم کرنے کے لئے انسانی بھیس بدلا"؟ یہ سوال کر کے سپنسر صاحب خیال کرتے ہیں کہ گویا اُنھوں نے مکاشفہ کی تعلیم کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ وہ پہلے خدا کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں۔ جن سے خدا لاکھوں کوس ہم سے دُور چلا جاتا ہے۔ اور پھر ہم سے کہتے ہیں کہ ہم خدا کی اس دوری کے ساتھ اس تصوّر کو ربط دیں جو بالکل اُس کے برعکس ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ شائد اُنھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ خدا نہ صرف سبب اول یعنی ستاروں اور نظاموں کا ایک لامحدود اور قادر خالق ہے بلکہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر بھی ہے۔ کہ وہ ہر مخلوق سے ایسا نزدیک ہے کہ کوئی اور ایسا نزدیک نہیں ہے۔ اگر مسٹر سپنسر صاحب

غور کرتے تو شائد اُنکے اپنے اصول ہی اُن کو اس نتیجہ تک پہنچا دیتے ۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔ کہ "اے انسان تو بول کیونکہ وہ سنتا ہے ۔ اور رُوح رُوح کے ساتھ مل سکتی ہے ۔ وہ تو تیری سانس سے زیادہ تر تیرے نزدیک ہے ۔ ہاتھ اور پاؤں اسقدر نزدیک نہیں جسقدر وہ ہے۔" مزید برین یہ بات بھی نظر انداز نہ ہو کہ وہ جو اسقدر نزدیک ہے وہ لامحدود مہر اور محبت بھی ہے ۔ اب اگر اُس میں یہ صفات موجود ہوں تو کیا اُس کا ایک آرامی چوپان کو اپنے نزدیک بُلانا اور اُسکے ساتھ بدیں غرض عہد باندھنا کہ اُس کے وسیلے سے تمام بنی آدم کو برکت پہنچے ایک اجنبی اور عجیب بات ہے ؟

اب آخر میں ہم ایک اور خیال پیش کرتے ہیں ۔ اور وہ مخالفوں کے اعتراض کا کامل جواب ہے ۔ اگر مسیحی مذہب کی تعلیم درست ہے تو خدا کا منشاء صرف اس چھوٹے سے سیّارے پر محدود نہیں رہتا بلکہ خلقت کے تمام طبقات اُس میں شامل ہیں ۔

مسیح کا تجسّم ایسا واقعہ نہیں کہ جس کی حقیقت کا تعلق محض اسی زمین سے ہو اور بس ۔ پاک نوشتے ایسا ظاہر نہیں کرتے ۔ اُنکے مطالعہ سے تو یہ صداقت دل پر نقش ہوتی ہے کہ خدا کا ارادہ نہایت ہی وسیع ہے ۔ اور کہ وہ دُور دُور تک پہنچتا ہے ۔ اور بڑے بڑے نتائج اُس میں شامل ہیں ۔ شائد لوگ اس مسیحی صداقت پر ہمارے خیال میں یہ اعتراض کرینگے کہ یہ دعوے اس زمین کی بنیاد پر قائم ہو کر ایسا بلند اُٹھتا ہے ۔ کہ اسکا ماننا ناممکن ہے یعنی جب یہ کہا جاتا ہے کہ انجیل کا اثر جس کی تعلیم اس زمین پر دی گئی خلقت کے مختلف طبقات پر پڑتا ہے یہاں تک کہ فرشتے بھی نجات کے بھید کو سمجھنے کے خواہشمند ہیں ۔ اور آسمانی جگہوں کی ریاستیں اور قدرتیں خدا کی بوقلموں حکمت کا سبق اس سے سیکھتی ہیں ۔ اور کہ تمام اشیاء کیا آسمانی اور کیا زمینی مسیح میں مل جائینگی ۔ ہاں جب اس قسم کے دعوے انجیل کی نسبت جو اس زمین پر نمودار ہوئی پیش کئے جاتے ہیں ۔ تو

گویا ایک ایسی تجویز ہمارے سامنے رکھی جاتی ہے۔ جس کی عظمت اور وسعت ہمارے یقین کی رسائی سے بہت بلند اور بالا ہے۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا کی تجویز واقعی ایسی عظیم الشان ہو جیسی کہ انجیل کے بیان سے ٹپکتی ہے تو اس بات پر کہ اُسکا شروع اس چھوٹی سی زمین سے ہونا ہے۔ کیا اعتراض کیا جا سکتا ہے؟ اس اعتراض کا اور نیز اسی طرح کے اُس اعتراض کا جو مسیح کی پستی پر کیا جاتا ہے۔ کامل اور اطمینان بخش جواب ان لفظوں میں پایا جاتا ہے۔ "انجام کو دیکھو"

۲- جو باتیں دین عیسوی کے مطابق انسان کے انجام اور عاقبت کے ساتھ علاقہ رکھتی ہیں۔ اُن پر غور کرتے وقت یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُنکا تعلق خاص آئندہ کے ساتھ ہے۔ لہٰذا وہ اُن باتوں سے جو گذشتہ ہیں واقع ہو چکی ہیں۔ مختلف ہیں۔ جب ہم خدا کے گذشتہ مکاشفوں پر غور کرتے ہیں۔ یعنی اُن زمانوں پر جو مسیح کی آمد سے پہلے گذرے۔ یا خود مسیح کی زمینی زندگی اور مکاشفہ پر اور نیز اُن باتوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو خدائے تعالےٰ اپنے انتظام ربّی کے مطابق کلیسا میں کرتا آیا ہے تو ہم اُن باتوں پر غور کرتے ہیں۔ جو وقوع میں آ چکی ہیں۔ یہ ساری باتیں ہمارے سامنے واقع شدہ امور کی طرح آتی اور ہم اُن سے اُسی طرح استدلال کر سکتے ہیں۔ جس طرح کہ اُن واقعات سے کیا کرتے ہیں۔ جن سے ہم کلی اور جزوی طور پر بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ لیکن جب مکاشفہ کے سامنے آتے جو ابھی تک وقوع میں نہیں آئے۔ خصوصاً وہ جن کی صورتوں اور حالتوں کا ہم مطلق علم نہیں رکھتے۔ ہاں جب اس قسم کے واقعات سامنے آتے ہیں تو معاملہ دگرگوں ہو جاتا ہے۔ اِن واقعات کا محض ایک مختصر سا نقشہ ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔ اور وہ بھی بہت درجہ تک تشبیہ اور استعارے اور کنائے کا لباس پہنکر یا یوں کہیں کہ روحانی مغز جسمانی لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر آئندہ کی حالتوں کو پیش

کرتا ہو تو اُنہیں اُن صورتوں میں پیش کرنا پڑیگا۔ جو جانے ہوئے علاقوں سے اخذ کی گئی ہیں۔ گویا وہ خیالات اور صداقتیں جن کا پیش کرنا منظور ہوگا۔ وہ کافی طور پر واضح ہونگی۔ لیکن جن صورتوں میں ظاہر کی جائینگی۔ وہ استعارے اور تشبیہ کی شکل اختیار کرینگی

یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک طرف تو لوگوں نے نبوی کلام کے لفظی معانی لینے پر بہت زور دیا ہے۔ اور دوسری جانب یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض نے اس کلام کو تشبیہی کلام سمجھکر بالکل ترک کر دیا ہے۔ مثلاً رِٹشل صاحب نے عاقبت کے ساتھ علاقہ رکھنے والی باتوں کو بسبب اُن کے تشبیہی لباس کے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ اُن کو ذرا بھی قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ لیکن سوال برپا ہوتا ہے۔ کہ اگر اُنکا کچھ مطلب نہ تھا تو اُن کو نئے عہد کے منصف استعمال میں کیوں لائے؟ رِٹشل صاحب کے نزدیک جو بات قابل وقعت ہے وہ خدا کی بادشاہت کا تصور ہے۔ پس وہ کہتے ہیں کہ اُس تصوّر کو ایک تاریخی واقعہ بنانے کیلئے ہمکو صرف اسی دنیا میں محنت کرنا ہے۔ کیونکہ جو صورت خدا کی بادشاہت اس زندگی کے بعد اختیار کریگی۔ اُسکا علم ہم کو نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارا تعلق اُس کے ساتھ فی الحال کچھ بھی نہیں ہے۔ رِٹشل صاحب کے اس یکطرفہ پہلو سے اُنکے شاگردوں نے جو بعد میں پہلو تہی اختیار کی ہے اُس کی کیفیت بالخصوص کافتن صاحب کے انداز سے اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے جنہوں نے رِٹشل صاحب کے خیال کو بالکل بدل دیا ہے۔ کافتن صاحب خدا کی بادشاہت کا فائدہ فقط اُس زندگی میں دیکھتے ہیں۔ جو بعد میں آنیوالی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اسبات کا یقین کہ "خدا کی بادشاہت میں جو اس دنیا سے بلند و بالا ہے۔ اور جو ابھی ہم سے بہت دُور ہے۔ ہمیشہ کی زندگی کا پایا جانا مسیحی دینداری کی جان ہے" ہمارے خیال میں یہ دوسرے سرے کا مبالغہ ہے اور

اس کے مقابلہ میں ہم رٹشل کے خیال کی کہ اس دنیا میں بھی خدا کی بادشاہت پائی جاتی ہے۔ اور کہ اُس میں داخل ہونے کی کوشش کرنا چاہئے ہمیں تصدیق کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ مسیح اور کس لئے آیا؟ اگر اس لئے نہیں آیا کہ بنی آدم کو ایک نئی زندگی بخشے جو باطن سے ظاہر کی طرف شگفتہ ہو کر تمام انسانی رشتوں کو اپنے رنگ سے رنگین کر دے۔ یہانتک کہ خاندانی اور سوشل زندگی۔ تمام حرفے اور تجارتی کام۔ ہر طرح کا علم و ہنر سرکاری قوانین اور بنی آدم کے باہمی علاقے اُس سے موثر ہوں اور دنیا کی تمام بادشاہتیں ہمارے خداوند اور اُس کے مسیح کی ہو جائیں (مکاشفات ۱۱: ۱۵) اب خدا کی بادشاہت کے اس نتیجہ کا وقوع میں آنا ضروری امر ہے۔ خواہ وہ جلد وقوع میں آئے خواہ دیر میں۔ خواہ ملامت سے نمودار ہو خواہ جیسے کہ نوشتے ظاہر کرتے ہیں بڑے بڑے مشکل اور کٹھن واقعات کے بعد رونما ہو۔ بہر حال اس نتیجہ کا وقوع میں آنا لازمی امر ہے۔ پس اس وقت ہمارا یہ فرض ہے اور ہمارے لئے یہی بات باعث افتخار ہے کہ ہم اس نتیجہ کے وقوع کے لئے دعا مانگیں۔ اور سرگرمی سے محنت کریں۔ مسیحی مذہب پر دشمن کیا الزام لگاتے ہیں؟ یہی کہ مسیحی دین کے پیرو دوسری دنیا کے خیال میں مخمور رہتے ہیں یعنی اُس برکت پر جو اس دنیا کے بعد نصیب ہونے والی ہے۔ اپنا دل لگائے رہتے ہیں۔ اور اُن مفید باتوں کو جو اس دنیا میں کرنی چاہئیں ہاتھ نہیں لگاتے؟ اب اس الزام کو دُور کرنے کا علاج کیا ہے؟ یہ کہ ہم دکھائیں کہ دنیاوی اور سوشل زندگی کی نجات کے لئے بھی مسیحی دین ایک طاقت ہے۔ ایک خمیر ہے۔ جسے انسانیت کے تمام آٹے میں سرائیت کرنا ہے۔ اس سوشل زندگی کے لئے آجکل مسیحی کوشش کے لئے ایک وسیع میدان کھُلا ہے۔ اسی خدمت کے متعلق مسیحی مذہب اس زمانہ میں خاص تحریکوں کو برپا ہوتے دیکھتا ہے۔ ہاں اس زمانہ

کے لوگوں کو جو بڑے بڑے مقاصد پیش نظر ہیں۔ وہ سوشل ہی ہیں۔ پازیٹوازم (اسی دنیا کی بہتری کو مدنظر رکھنے والے عقیدہ) کا تکیہ کلام آلٹروازم ہے یعنی یہ کہ انسان کی بہتری کے لئے کوششیں کی جائیں۔ آجکل تمام ہوا سوشل اصلاح کی ترکیبوں اور تجویزوں اور ناممکن الوقوع خیالوں سے پُر ہے۔ پس ہم جو اعتقاد رکھتے ہیں کہ مسیحی مذہب ہی وہ طاقت ہے جو پورے طور پر اُن باتوں کو وجود میں لاسکتی ہے۔ جن کی تلاش میں انسانی تجویزیں لگی ہوئی ہیں۔ ہم پر فرض ہے۔ کہ ہم لوگوں کو اپنے ایمان کا ثبوت دیں۔ کہ نہ صرف باتوں میں بلکہ عملی طور پر خدا کی بادشاہت اُن کے نزدیک آپہنچی ہے۔ ہمکو کچھ کچھ معلوم ہے کہ مسیحی دین نے رومی سلطنت کے عہد میں کس طرح اس بات کو ثابت کردیا۔ کہ دین عیسوی سوشل پاکیزگی اور اصلاح کے لئے ایک طاقت ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ زمانۂ متوسط میں اُس نے جاہل قوموں کے سچے مسیحی اور آدمی بنانے میں کیسے عجیب کام کئے۔ ہم کو معلوم ہے کہ زمانۂ حال میں بھی اُس نے کس طرح اس صدی کی اخلاقی اور حب انسانی سے معمور تحریکوں کو جوش کی آگ سے بھر کر اپنے آپ کو ایک عجیب طاقت ثابت کر دیا ہے۔ اور امید یہ ہے کہ مسیحی مذہب کی یہ طاقت جو گذشتہ میں اس طرح جلوہ گر ہوئی آئندہ اور بھی زیادہ چمک دمک سے جلوہ نمائی کریگی۔ پس قبل اس کے کہ خدا کی بادشاہت پورے پورے طور پر آئے ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔

پس سوشیل پاکیزگی اور خوبی مسیحی مذہب کا وہ کام ہے۔ جو اس دنیا میں پایا جاتا ہے۔ اسی کو اس دنیا میں خدا کی بادشاہت کہتے ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اس بات کو بھی بھولنا نہیں چاہئے کہ جس طرح دین عیسوی کا کام اس دنیا میں یقینی ہے۔ اُسی طرح مسیحی مذہب کا وہ انجام جو اس زندگی کے بعد ظاہر ہونے والا ہے یقینی اور برحق ہے

بلکہ اس دنیا میں بھی خدا کی بادشاہت خارجی آرام اور خوشی یعنی کھانے پینے پر موقوف نہیں۔ بلکہ روح کی باطنی زندگی پر۔ یعنی اُس راستبازی اور اطمینان اور خوشی پر موقوف ہے۔ جو رُوح القدس کی طرف سے ہوتی ہے۔ (رومی ۱۴: ۱۷) تاریخ بھی اپنے انجام کی طرف قدم اُٹھائے ہے۔ اور اُس کا انجام یہ نہیں ہے۔ کہ سوسائٹی بدل جائے اور بس۔ بلکہ یہ کہ اس چندروزہ حالت کو چھوڑ کر وہ ابدیت میں پہنچ جائے۔ جہاں سب چیزیں نئی ہیں۔ اور جہاں خدا کی بادشاہت کی برکت پورے طور پر تجربہ سے گزرے گی۔

اب ہم اُن باتوں کی طرف متوجہ ہونگے جو مسیحی دین کی تعلیم کیمطابق انجام انسانی کے ساتھ خاص طور پر علاقہ رکھنے والی ہیں۔ یہاں پر بھی پہلے اُن باتوں کی طرف توجہ کرنا زیادہ مفید ہوگا جو بہت اُبھری ہوئی اور بالکل صاف ہیں اور وہ تین ہیں۔ اگر اُن پر تجسم کی روشنی میں غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ انسان کی نجات سے خدا کو کیا مقصد مدِنظر ہے۔ (۱) ایمانداروں کی نسبت جو مقصد خدا کو مدنظر ہے۔ وہ الفاظ "بیٹے کے ہمشکل ہونا" سے بخوبی مترشح ہے۔ چنانچہ لکھا ہے "جنہیں اُس نے پہلے سے جانا اُنہیں پہلے سے مقرر بھی کیا کہ اُس کے بیٹے کے ہمشکل ہوں تاکہ وہ بہت سے بھائیوں میں پہلوٹا ٹھہرے" (رومی ۸: ۲۹) یہ بات آئندہ یا آخرت کے ساتھ علاقہ رکھنے والی باتوں میں بالکل صاف ہے۔ یعنی آئندہ زندگی کے مسئلہ کے اور حصص پر جو تاریکی کا سایہ گرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اُس سے یہ بات بالکل بری ہے۔ "ابھی ہم سب چیزیں انسانیت کے تابع نہیں دیکھتے" البتہ اُس کو دیکھتے ہیں جو فرشتوں سے کچھ ہی کم کیا گیا۔ یعنی یسوع کو کہ موت کا دُکھ سہنے کے سبب جلال اور عزت کا تاج اُسے پہنایا گیا" (عبرانی ۲: ۸ و ۹) اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارا انجام بھی اُسکے انجام کی مانند ہوگا۔ نمونہ کے ساتھ اعلیٰ درجہ

مشابہت پیدا کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ البتہ یہ بات کہ یہ نتیجہ کس طرح پیدا ہوگا ہم کو معلوم نہیں پر ایماندار کا انجام روز روشن کی طرح لائح ہے۔ نیز یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ مسیح کی مانند یا اُسکے ہمشکل ہونے کا کام جو زمین پر شروع ہوا ہے آسمان پر کمال کو پہنچیگا۔(۲) یہ مشابہت جو ایماندار مسیح کیساتھ رکھتا ہے۔ محض اخلاقی اور روحانی باتوں ہی میں نہیں ہوگی بلکہ اس بات میں بھی ہوگی کہ ایماندار کا جسم مسیح کے جلالی جسم کی مانند بنجائیگا۔ یعنی اس میں جسم کی نجات یا یوں کہو کہ زندگی کا جلالی جسم میں نمودار ہونا بھی شامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مسئلہ کے ساتھ بہت سی مشکلات وابستہ ہیں۔ شائد کوئی کہے گا کہ "مردے کس طرح جی اُٹھتے ہیں۔ اور کیسے جسم کے ساتھ آتے ہیں؟ (اقرنتن ۱۵: ۳۵) بدن کی قیامت کے متعلق بھی کئی باتیں ہیں جو بہت صاف اور واضح ہیں۔

(الف) جسم کا نجات پانا نجات کے مسیحی تصور کے استکمال کے لئے ضروری ہے۔ گویا جسم کی نجات اس تصور کا اصلی اور حقیقی حصہ ہے نہ کہ عارضی یا مجازی۔ جب ہم بقا اور غیر فانیت کی نسبت لکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے دکھایا تھا کہ نجات کے تصوّر کو کامل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ نہ صرف روح بلکہ روح اور جسم دونوں یعنی انسان اپنی مرکب شخصیت میں نجات پائے۔ جسم سے الگ ہونے کی حالت میں بھی ایماندار بیشک خداوند مسیح کے ساتھ رہتا ہے۔ اور اُس کی لگاتار رفاقت کی برکت سے خوشوقت ہوتا ہے۔ لیکن اُسکی زندگی کی تکمیل اُس کے بدن کی قیامت سے ہوگی۔

(ب) دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ بدن کی قیامت پر جو بعض اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ مثلاً یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ جو جسم بالکل گل گیا اور سڑ گیا ہے اور جسکے ذرّے آسمان کی ہواؤں میں جا ملے۔ یا شاید اور اجسام میں جاکر داخل ہو گئے ہیں وہی

جسم بھلا پھر کیونکر اٹھ سکتا ہے۔لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ قیامت کے مسئلے کے متعلق مسیحی یہ نہیں مانتے کہ جسم کے وہی ذرّے جی اُٹھینگے جو اسوقت اُسمیں پائے جاتے ہیں۔ مسیحی لوگ ذرّوں کی مداومت کے معتقد نہیں وہ اُس کی آئیڈنٹٹی مشابہت کے قائل ہیں۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ ذرّات چاہے لاکھ بدلیں لیکن یہ بات کہ فلاں شخص فلاں شخص ہے کبھی نہیں بدلتی۔ بچپن۔ جوانی اور بڑھاپے میں بیماری اور تندرستی میں زیدؔ زیدؔ ہی رہتا ہے اور دیکھنے والے اُسکو زید ہی سمجھتے ہیں۔ غور کیجئے کہ اس دنیا میں ہمارے اجسام کا وہی ہونا اس بات پر متعلق نہیں کہ ہمارے جسم کے ذرّے وہی ہیں جو چند برس پہلے تھے۔ کیونکہ یہ ذرّے تو برابر بدلتے رہتے ہیں۔ پس حقیقی آئیڈنٹٹی کس بات میں پائی جاتی ہے؟ ہمارے نزدیک آئیڈنٹٹی کا اصل جوہر اُس زندہ طاقت میں پایا جاتا ہے۔ جو ذرّات مادّی کو آپسمیں پیوست رکھتی۔ جو زندگی کے ساتھ ہر ذرہ کو اعضا میں جگہ دیتی جوان کی صورتوں اور شکلوں کو سانچے میں ڈھالتی اور اُنکو روح کی یگانگت میں قائم رکھتی ہے۔ تاکہ اُن کے وسیلے سے روح اپنے آپ کو ظاہر کرے۔ یہ طاقت جو گویا اعضاء کے بنانے اور ترتیب دینے والا اصول ہے۔ یہ اپنی ذات میں روحانی اور غیر مادّی ہے۔ موت کے وقت بدن زائل ہو جاتا ہے۔ اور عناصر میں جاملتا ہے۔ لیکن وہ زندہ اور غیر مادی اصول قائم رہتا ہے۔ اور اس بات کے لئے تیار ہوتا ہے کہ جب خدا کی مرضی ہو اُسوقت ایک نئے بدن کو جو بہ سبب اپنی زیادہ روحانیت کے زیادہ ذی شان ہوگا۔ پھر وجود میں لائے۔ ہم اسبات کو مانتے ہیں۔ کہ اسمیں بڑا بھید مخفی ہے۔ لہٰذا ہم فطری قوانین کی بنا پر قیامت کے بھید کو نہیں جان سکتے۔ ہم صرف اُتنا ہی جان سکتے ہیں جتنا کہ مسیح نے سکھایا ہے اور اُسے اس بنا پر مانتے ہیں کہ خدا کی قدرت سب کچھ کر سکتی ہے۔

قیامت ایک معجزہ ہے بلکہ تمام معجزات کا سرتاج ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ ہم اس بھید کو جتنا کہ وہ دراصل ہے اُس سے زیادہ بڑا نہ بنائیں۔ اس بات پر زور دیکر کہ عیسائی نئے جسم اور پُرانے جسم میں مادّی یکسانیت کے قایل ہیں حالانکہ نوشتوں کی تعلیم اس بات کو بالکل نہیں مانتی۔ چنانچہ پولوس رسول صاف اور واضح طور پر اس دعوے کی تردید کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے "اے نادان تو خود جو کچھ بوتا ہے جب تک وہ نہ مرے زندہ نہیں کیا جاتا۔ اور جو تو بوتا ہے یہ وہ جسم نہیں جو پیدا ہونے والا ہے۔ بلکہ صرف دانہ ہے خواہ گیہوں کا خواہ کسی اور چیز کا۔ مگر خدا نے جیسا ارادہ کرلیا ویسا اس کو جسم دیتا ہے۔ اور ہر ایک بیج کو اُس کا خاص جسم"۔ اب اس مثال میں ہم صاف صاف دیکھتے ہیں کہ مادّی ذرات کی یگانگت یا یکسانیت بہت ہی تھوڑے درجہ تک پائی جاتی ہے۔ اور وہ بھی لازمی نہیں بلکہ اتفاقی طور پر اور کہ اصل یگانگت کا اصول اُس زندگی والی طاقت میں پایا جاتا ہے جو دونوں اجسام کو قیامت سے پہلے اور بعد والے اجسام کو باہم ربط دیتی ہے۔

(ج) تیسری بات یہ ہے کہ جسم کی قیامت موت کیوقت وقوع میں نہیں آتی۔ بلکہ وہ ایک ایسا واقعہ ہے۔ جو آئندہ زمانہ میں واقع ہوگا۔ جبکہ تمام اشیاء اپنے کمال کو پہنچ جائینگی۔ مگر اس کے برعکس تعلیم کو بھی اس زمانہ کے بہت لوگوں نے مانا ہے۔ اُن میں "اَن سِتین یونیورس" کے مصنف شامل ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے خیال کو ذیل کے جملوں پر قایم کرتے ہیں۔ "ایسی عمارت جو ہاتھ کا بنا ہوا گھر نہیں بلکہ آسمان پر ابدی ہے"۔ "اپنے آسمانی گھر سے ملبس ہو جانا" وغیرہ (۲ قرنتی ۵: ۱ و ۲) لیکن ہمارے خیال میں یہ عقیدہ کہ قیامت مرتے ہی وقوع میں آجاتی ہے۔ نوشتوں کے عام بیانوں سے موافقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ قیامت کو بالعموم ایک ایسا وقوعہ سمجھتے ہیں جو آئندہ زمانہ میں واقعہ ہونے والا ہے۔ اور ایماندار کی حالت کو اسوقت تک "غیر ملبس" بتلاتے ہیں۔ نوشتے جو بات سکھاتے

ہیں وہ یہ ہے کہ فی الحال اس روحانی جسم کی تیار ہو رہی ہے۔ یعنی مسیح کی رُوح کے حصول اور کام کے وسیلے روحانی بُنیاد اس کیلئے قائم ہوتی جاتی ہے۔

۳۔ مسیحی تعلیم کے مطابق جو کمال کی حالت بالآخر وقوع میں آنیوالی ہے اُس میں نہ صرف ایمانداروں یعنی خدا کے فرزندوں کے کمال کا خیال شامل ہے بلکہ خارجی فطرت کے کمال اور جلال کا خیال بھی شامل ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان کو قیامت کیوقت جسمانیت حاصل ہوگی خواہ وہ کسی قسم کی ہو تو اُس کا تعلق اردگرد کی چیزوں یعنی اشیاء کے عام سلسلے سے ضرور ہوگا۔ پس خارجی اشیاء کا بدل جانا بھی لازمی ٹھیراتا کہ انسان کے کامل جسم اور خارجی جسمانی اشیاء کے درمیان موافقت پائی جائے لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ ایک نیا آسمان اور نئی زمین ہو ورنہ جلالی جسم یا بدن عنقا ہوگا۔ پس کلام اللہ میں اس بات کا صاف صاف بیان پایا جاتا ہے۔ کہ فطرت یعنی تمام مخلوقات بطالت اور فنا کے قبضے سے چھوٹ جائیگی۔ اب یہ دریافت کرنے کی کوشش کرنا کہ اُس وقت کون کونسی تبدیلیاں وقوع میں آئینگی۔ اور اِن کا رشتہ اُن تبدیلیوں سے کیا ہوگا جنکی نبوت سائنس کر رہی ہے۔ ہماری رسائی سے بعید ہے ہم اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ دن جب آئیگا تب یہ راز سربستہ آپ ہی وا ہو جائیگا۔

اس آخری کمال کے متعلق جسکا ذکر ہم نے اوپر کیا کئی باتیں ہیں۔ جن کی طرف ہم اس وقت متوجہ ہونگے۔ اُن میں مسیح کی دوسری آمد اور عدالت عامہ کے مسائل شامل ہیں۔ جن پر خداوند مسیح کے اقوال اور رسولوں کے بیانات بکثرت موجود ہیں۔ لیکن اُن کے متعلق بھی یہ سوال درپیش ہے۔ کہ انکی تاویل کس طرح کرنی چاہیئے؟ ہم پہلے مسیح کی دوسری آمد پہ غور کرینگے اور اِسکے ضمن میں اُن خیالات کو پیش کرینگے۔ جو اُن آیات

کا جو مسیح کے دوبارہ شخصی طور پر آنے سے وابستہ ہیں لفظی مطلب نہیں لیتے
اگر ہم پائیلخ صاحب کی تحریر کے ایک ٹکڑے کا مطلب بیان کر دیں تو
وہ "مشتے نمونہ از خروارے" کا کام دیجائیگا۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ مسیح کا یہ کہنا کہ
مَیں بادلوں پر سوار ہو کر پھر آؤنگا ایک مجازی کلام ہے جسکے وسیلے سے ظاہر ہوتا ہے
کہ گویا وہ ان تمام حالتونکو دیکھ رہا ہے۔ جو اُس کی موت کے بعد وقوع میں آنیوالی
ہیں۔ پس وہ دیکھ رہا ہے کہ زمین پر جو پستی کی حالت اور صلیب کی ذلیل
موت اُس کو نصیب ہوئی۔ اُس کے بالکل برعکس جلال اُس کو نصیب
ہوگا۔ اور یہ جلالی حالت اُسکی قیامت سے لیکر اُس کی بادشاہت کے
کمال تک جو آخری دن وقوع میں آئیگا ترقی کرتی جائیگی۔ اور پھر وہ کہتے
ہیں کہ جسقدر زیادہ ہم اس وسیع مجازی بیان کی اصلی نبوی خاصیّت
کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اور نیز اس بات کو یاد رکھتے ہیں کہ مسیح کا یہ بیان بھی
اُن قیود سے آزاد نہیں۔ جو ہر نبوت کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ تو
اسیقدر زیادہ ہم کو مسیح کی تعلیم کے اس نبوی حصہ کی اُس مشکل کا حل
ملجاتا ہے۔ جو پہلے بالکل سمجھ سے باہر معلوم ہوتی ہے"۔ اب ہمارا یہ خیال
ہے۔ کہ اگر ہم اُن مقامات کا بغور مطالعہ کریں۔ جن میں مسیح کی دوسری آمد
کا ذکر پایا جاتا ہے تو ہمیں صاحب موصوف کے ساتھ ایک بات پر ضرور
اتفاق کرنا پڑیگا۔ اور وہ یہ ہے کہ خداوند یسوع اپنے آنے کی نسبت ہمیشہ
ایک ہی معنی میں کلام نہیں کرتا۔ یا یوں کہو کہ اُس کا آنا ایک ایسا تسلسل
ہے۔ جس میں اُس کے آنے کے متعلق کئی قسم کے عناصر گندھے ہوئے
ہیں۔ پس اُس کے آنے کو ایک خاص قسم کا آنا جو ایک ہی معنی رکھتا ہو۔
نہ سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ جب وہ سردار کاہن سے اِس معاملہ میں کلام
کرتا ہے تو دانیل کی نبوت کی نسبت صاف اشارہ کر کے فرماتا ہے ۔
"اس کے بعد تم ابنِ آدم کو قادر مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے
بادلوں پر آتے دیکھو گے"۔ وہ اپنے شاگردوں کے پاس اپنی قیامت کے

بعد آیا۔ پھر وہ رُوح القدس کے نزول میں آیا۔ اور اسی طرح اپنی بادشاہت کی قدرت اور اشاعت میں آیا اور خصوصاً اُس وقت جب کہ یہودی کلیسائی کے بندھن ٹوٹ گئے۔ کیونکہ ذیل کے مقام کا یہی مطلب ہوسکتا ہے۔ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو یہاں کھڑے ہیں اُن میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک ابنِ آدم کو بادشاہ ہوکر آتے ہوئے نہ دیکھ لینگے۔ ہرگز موت کا مزہ نہ چکھینگے"۔ (متی ۱۶: ۲۸) کلیسا کی تاریخ کے ہرایک روزِ عظیم میں وہ اپنی کلیسا میں آیا۔ اور آئندہ واقعات میں اور بھی زیادہ نمود کے ساتھ آئیگا۔ مگر باوجود اس طرح طرح کے آنے کے ہم بائسلخ صاحب کے ساتھ اتفاق نہیں کرسکتے جبکہ وہ اس مختلف قسم کے آنے کی بنا پر مسیح کے آخری اور شخصی طور پر جلال اور قدرت کے ساتھ آنے کا اِنکار کرتے ہیں۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیح خداوند نے جو کچھ اِس بات کی نسبت کہا ہے اور جسے رسولوں نے بھی بار بار دہرایا ہے وہ ایسا صاف اور واضح ہے کہ ہم اُسکو محض مجازی کلام نہیں مان سکتے۔ پس ہم کلیسائے عامہ کے اِس عقیدہ سے متفق ہیں کہ مسیح "وہاں سے (یعنی آسمان سے) زندوں اور مُردوں کا انصاف کرنے آئیگا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ بائسلخ صاحب جو مسیح کے مُردوں میں سے جی اُٹھنے اور جسم کے ساتھ آسمان پر چڑھ جانے کو پورے طور پر مانتے ہیں کیوں اُسکے دوبارہ شخصی طور پر آنے کے مُنکر ہیں؟ اگر یہ صحیح ہے کہ وہ آسمان پر چڑھ گیا۔ تو پھر اُس کا جلال کے ساتھ واپس آنا کیوں غیر ممکن یا غیر مناسب سمجھا جائے؟

اور یہی حال اُس آخری عدالت کا ہے جو اُس کے نمود کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیونکہ اُس کی نسبت بھی ہم ایک طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی عدالت متواتر طور پر ہورہی ہے۔ دنیا کی تاریخ ایک طرح دنیا کی عدالت ہے۔ پر اِس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ مسیح نے جو کچھ نیکی اور بدی کے نتائج

پکنے اور فصل کی حالت تک پہنچنے اور پھر نیک و بد کے جدا جدا کئے جانے کی نسبت فرمایا ہے۔ اور جو کچھ رسولوں نے خداوند کے کلام کی تائید میں کہا ہے اُس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ایک حساب کا دن ہے۔ جس میں خدائے تعالےٰ یسوع مسیح کے وسیلے بنی آدم کا انصاف کریگا۔ اس انصاف سے ایک تو یہ بات ظاہر ہوگی کہ خدا نے دنیا کے انتظام و حکومت کے بارے میں جو کچھ کیا ہے وہ سب راست ہے۔ اور دوسری یہ بات سرانجام پائیگی کہ ہر شخص اپنی کرنی کے مطابق بدلا پائیگا۔ علاوہ بریں اس قیاس سے کہ دنیا ایک انجام کی طرف جا رہی ہے۔ اور کہ دنیا کی موجودہ حالت میں نقص پائے جاتے ہیں :. خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی آخری عدالت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس عدالت کے موقعہ پر دنیا کی عالمگیر تاریخ کے راز کھل جائینگے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا انکار بھی نہیں ہوسکتا کہ اس حقیقت کا بیان تشبیہی اور مجازی اور تمثیلی پیرا یہ میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم اس عدالت کی نسبت سوائے اُن بڑے بڑے اصولوں کے جن پر عدالت مبنی ہوگی اور کچھ اخذ نہیں کر سکتے۔

٣۔ ہم اب ان آخری باتوں کا ذکر کرتے کرتے بتدریج اُس منزل تک پہنچ گئے ہیں جو ہمارے لئے ایک خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص کا جداگانہ انجام کیا ہوگا؟ یہ تو ہم دکھا چکے ہیں کہ ایماندار کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن سوال برپا ہوتا ہے کہ روشنی کے مقابل جو تاریکی نظر آتی ہے۔ زندگی کے انعام کے مقابل جو موت کا فتوےٰ دکھائی دیتا ہے خدا کے فضل سے بچے ہوؤں کے مقابل جو اُسکے عتاب کے گرفتار معلوم ہوتے ہیں اُن کا کیا حال ہوگا؟ واضح ہو کہ یہ سوالات اس قسم کے نہیں کہ ان کو ہم نے اپنی مرضی سے گھڑا ہے۔ بلکہ یہ وہ سوالات ہیں جو نوشتوں کے صاف اور واضح بیانوں اور ضمیر کی کاوشوں اور اُن بیچینیوں سے جو گنہگار کے دل میں برپا ہوتی ہیں پیدا ہوتے ہیں۔ معلوم ہو کہ ان سوالات

کے جواب میں تین خاص جواب دیئے گئے ہیں۔ اور دیئے جاتے ہیں۔

(۱) پہلا جواب یہ ہے کہ سب بچ جائینگے۔ یہاں تک کہ ایک بھی ہلاک نہ ہوگا۔ اس کو انگریزی میں یونیورسلزم کہتے ہیں۔ قدیم کلیسا میں آریجن اس عقیدہ کو مانتا تھا۔ اور شلائر میخر صاحب بھی اس خیال کے معتقد تھے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "نجات کی طاقت کے ذریعہ سے آخرکار تمام انسانی ارواح خدا کی طرف رجوع لائیں گی"۔ ایک شخص بنام سموئیل کاکس گذرے ہیں۔ وہ اس تعلیم کو اور بھی زیادہ صفائی سے یوں بیان کرتے ہیں "ہمارے بھائی (یعنی دوسری تعلیم کے ماننے والے) خداوند مسیح کی نجات کو اسی دنیا کی زندگی تک محدود رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محض بعض اشخاص اس سے فائدہ اُٹھائینگے۔ لیکن ہم اس کا اثر آنے والی زندگی تک پہنچاتے ہیں۔ اور ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ اس نجات سے آخرکار سب بنی آدم فائدہ اُٹھائیں گے۔ مشہور شاعر ٹینی سن بھی اس کو آرزو کی صورت میں پیش کرتے ہیں مثلاً ایک شعر میں جس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے یوں کہتے ہیں کہ ہمیں یہ آرزو ہے کہ جتنے زندہ بنی آدم موجود ہیں اُن میں سے ایک زندگی بھی قبر کے بعد ہلاک نہ ہو۔ اب یہ عقیدہ ایسا ہے کہ اگر اس کی سچائی پر ہم کو کلام اللہ سے کافی روشنی ملے۔ تو ہم سب بڑی خوشی سے اِس کو قبول کرینگے۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ سب بے ایمان ہلاک ہونگے۔ اس کو کبھی کبھی انگریزی زبان میں کنڈیشنل اِمارٹیلیٹی بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ مسیح پر ایمان لانا حیات ابدی کے حاصل کرنے کی شرط ہے۔ یعنی جو اُسکو قبول نہیں کرتے وہ فنا ہو جائینگے۔ اِس کو اِنائی ہیلیشن تھیوری بھی کہتے ہیں۔ یہ عقیدہ مذکورہ بالا خیال یا مسئلے کے جو یہ مانتا ہے کہ کوئی بھی ہلاک نہ ہوگا۔ بالکل برخلاف ہے۔ انگلستان میں اس خیال کے بڑے حامی ڈاکٹر ایڈورڈ دھائٹ صاحب گذرے ہیں۔ کچھ اس سے ملتا جلتا خیال وہ ہے جسکو بشنل صاحب پیش کرتے ہیں۔ وہ بدکار لوگوں کے بدخیالوں

اور بدچالوں کے نتائج معلومہ سے جو زندگی کی طاقتوں کو زائل کرنے والے ہوتے ہیں - استدلال کرتے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں میں زندگی کی طاقت اور سمائی رفتہ رفتہ کم ہو جائیگی - اور امکان یہ ہے کہ مدت مدید کے بعد وہ بالکل ضائع ہو کر معدوم ہو جائینگے - اس عقیدے نے بے شک ایک کام کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یونیورسلزم کی تصحیح کے لئے اس نے کلام کے اُن مقاموں پر خوب زور ڈالا ہے - جن سے شریروں کی آخری تباہی عیاں ہوتی ہے -

(۳) تیسرا عقیدہ وہ ہے - جو پراٹسٹنٹ کلیسیا ہمیشہ سے مانتی چلی آئی ہے - وہ شریروں کی ابدی سزا کا عقیدہ ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ شریر ہمیشہ ابدالاباد دُکھ کو محسوس کرتے رہینگے - اس عقیدہ کی عام صورت سے لوگ اس وقت بہت خوش نہیں ہیں - لہٰذا اس کے بیان میں اب کچھ کچھ تبدیلی آگئی ہے جو اس طرح ادا کیجاتی ہے - کہ شریر ہمیشہ تک دُکھ نہیں اُٹھائینگے - بلکہ ہمیشہ کے لئے کھوئے جائینگے -

اب آپ نے دیکھا کہ جو لوگ مسیح پر ایمان نہیں لائے اُن کے انجام کی نسبت تین مذکورۂ بالا عقائد موجود ہیں - اب سوال یہ ہے کہ ہم اِنمیں سے کسکو مانیں؟ ہم اپنی رائے ظاہر کرنے سے پیشتر بعض بُنیادی امور کو جن کی سچائی پر کسی طرح شُبہ نہیں ہو سکتا بیان کرنا چاہتے ہیں -

(الف) نبی کی بات جو الفاظ ذیل میں مندرج ہے ہمارے نزدیک ایک بُنیادی سچائی ہے وہ کہتا ہے کہ " راستبازوں سے کہو کہ بھلا ہوگا کہ وہ اپنے کاموں کا پھل کھائینگے - شریروں پر واویلا ہے - کہ بُرا ہوگا کیونکہ اُنکے ہاتھوں کی کمائی اُنہیں ملیگی - (یسعیاہ ۳: ۱۰ و ۱۱) بہ تبدیل الفاظ یوں کہو کہ گنہگار کا بدلا گنہگار کو ضرور ملیگا - یہ امر ایک غیر تبدیل اور بُنیادی سچائی ہے پس جو بات اس اصول کو کاٹے یا اُس اثر کو جو یہ اصول ضمیر پر رکھتا ہے - زائل کرے وہ سچی تعلیم کے برخلاف ہے - یہ بات ایک لاتبدیل شریعت

یا قانون کے وسیلے انسان کے دل پر ثبت کی گئی ہے اور یونیورس کی سطح پر لکھی ہوئی ہے کہ راستبازی بار استی زندگی ہے۔ اور گناہ ناگزیر تباہی اور موت ہے۔ اس قانون کی نسبت ہم یہانتک کہہ سکتے ہیں۔ کہ قادر مطلق کی قدرت بھی اسے بدل نہیں سکتی۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جب تک گنہگار اپنے گناہ میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ضرور ہے کہ وہ دُکھ اُٹھائے۔ اور باتوں کی نسبت جو راز سربستہ کی طرح پوشیدہ ہیں لوگوں کی آرا میں اختلاف ہو تو ہو لیکن اِس معاملے میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔

(ب) پھر ہمارے خیال میں اُن باتوں کو جن پر کلام نے صاف صاف روشنی ڈالی ہے۔ اُن باتوں سے جنپر کلام نے کسی طرح کی روشنی نہیں ڈالی یا ڈالی ہے تو بہت تھوڑی ڈالی ہے الگ رکھنا چاہیئے۔ یعنی ہمارا فرض یہ ہے کہ جن باتوں کے بارے میں نوشتے خاموش ہیں ہم بھی اُن کی نسبت خاموش رہیں۔ اور اُن پر بہت زور نہ دیں جب ہم بعض لوگوں کو اُن باتوں کی نسبت جو ابدیت کے دوروں میں واقع ہونے والی ہیں زور دیتے اور یہ کہتے سُنتے ہیں کہ یوں نہیں۔ یوں ہوگا تو ہمیں بڑا تعجب آتا ہے۔ ایسی باتوں کی نسبت یہی کہنا بہتر ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ کیا ہوگا۔ کلام اُن کی نسبت خاموش ہے اور ہماری عقلمندی اِسی میں ہے کہ ہم بھی کلام کے نمونہ پر چلکر خاموش رہیں۔

(ج) پھر ہمارے نزدیک یہ بھی ایک سچّا اصول ہے۔ کہ اس مشکل مسئلہ کے تمام پہلوؤں اور رشتوں کی نسبت کما حقہ فیصلہ کرنے کیلئے ایک ایسے اندازے کی ضرورت ہے جو اُس روشنی سے جو ہمارے پاس اس وقت موجود ہے بدرجہا بڑھکر ہو۔ بہت سے اشخاص کا خیال ہے کہ لوگ اُس تعلیم سے جو کلیسا اس بارہ میں مانتی ہے اسقدر اُن خاص آئتوں کے سبب سے جو اس تعلیم کے متعلق کلام میں پائی جاتی ہیں۔ روگردان نہیں ہوئے۔ جسقدر کہ وہ اُس عام اثر کے سبب سے منحرف

ہوئے جو اُن کے دل پر انجیلی مکاشفہ کی رُوح اور وسعت کو دیکھکر پیدا ہوتا ہے۔ جب انسان خدا کی سیرت پر جیسی کہ مسیح نے ظاہر فرمائی ہے۔ اور مسیح کے تجسم کی حقیقت پر اور کفارہ کی سچائی اور وسعت پر اور مسیح کے کام کے نتیجوں پر غور کرتا اور دیکھتا ہے کہ خدا کے تجسم اور نجات کی تجویز جتنے آدمیوں کو کھینچ لائی ہے۔ اُن کے شمار کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے۔ یعنی جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تجویز تو تمام دنیا کے لئے ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ دنیا میں بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ جو لوگ اِس کی آواز سُننے قدرے موثر بھی ہوئے ہیں اِن میں سے بہت تھوڑے ایمان لائے ہیں۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ جیسا نتیجہ اس تجویز کا ہونا چاہیئے تھا ویسا نہیں ہوا۔ پس لوگ اس مشکل کو زیادہ زیادہ محسوس کر کے پوچھتے ہیں کہ اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ جنہوں نے یسوع کا نام بھی سُنا نہیں؟ اور اُن لاکھہا لاکھ بنی آدم پر کیا گذریگی۔ جن کو اُس کے نام کے سُننے تک کا موقعہ بھی نہیں ملا؟ پھر اُن ہزارہا اشخاص کا کیا بنیگا۔ جو برائے نام مسیحی جماعتوں میں شامل ہوئے ہیں۔ لیکن مسیح کی سی زندگی بسر کر کے نئی پیدایش کا کچھ ثبوت نہیں دیتے بلکہ دنیا داری اور بے دینی کی زندگی کاٹ رہے ہیں؟ اس کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے۔ اور ہماری رائے میں یہ کہنا برحق بھی ہے۔ کہ جن کے پاس روشنی ہے وہ بے قصور نہیں سمجھے جائینگے۔ نجات اُن کے سامنے رکھی گئی اور اُنہوں نے اُس کو دیدہ دانستہ رد کیا۔ پر کیا یہاں بہت سی ایسی باتیں نہیں جنکو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے؟ بیشک لوگ اُس روشنی کے استعمال کے لئے جو کہ وہ رکھتے ہیں ذمہ دار ہیں۔ مگر اس معاملہ میں بھی بہت کچھ ایسا پایا جاتا ہے جو شخصی مرضی پر موقوف نہیں جو کہ موروثی تاثیروں۔ اردگرد کے حالات۔ پرورش یا تربیت کے اثرات اور واقعات کے وقوع سے موثر ہے۔ فقط خدا ہی کسوتِ سیرت میں کے اُن رشتوں

کو جوکہ آزادی کے دھاگے ہیں جدا کر کے کہہ سکتا ہے۔ کہ ہر انسان کی شخصی ذمہ واری کتنی ہے۔ اور کہ وہ بنی آدم کے جرم عام میں کتنا حصہ رکھتا ہے۔ لیکن مسیح خداوند کے کلام سے یہ بات صاف روشن ہے کہ وہ جو علیم کُل ہے اُس کے فیصلہ میں اِن باتوں میں سے کوئی بات بھی نظر انداز نہیں ہوتی۔ اور کہ سزا کی تقسیم میں بھی مدارج ہیں۔ یعنی سزا انسان کے علم اور مواقع کے ساتھ مناسب نسبت رکھتی ہے۔ جیسا کہ پولوس رسول فرماتا ہے کہ اُن میں جو "بغیر شریعت کے گناہ کرتے ہیں" اور اُن میں جو "شریعت کے ماتحت" ہو کر گناہ کرتے ہیں فرق ہے۔

اب ہم نے ان اصولوں کو پیش کر دیا ہے۔ لہٰذا اس وقت ہم چند سطور ان خیالوں کے متعلق تحریر کرینگے جو تعلیمات مرقومۂ بالا کی نسبت قید کتابت میں آ چکے ہیں۔

(۱) ہم تعلیم یونیورسلزم کو جو سب کی نجات کی قائل ہے قبول نہیں کر سکتے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی صاف اور واضح نوشتہ موجود نہیں جو یہ ظاہر کرتا ہو کہ آخر کار تمام بنی آدم نجات پائینگے۔ برعکس اِس کے کئی نوشتے ایسے موجود ہیں جو حالتِ دگرگوں پر گواہی دیتے ہیں۔ یعنی اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گنہگار ابدی ہلاکت میں گرفتار ہے۔ آرچ ڈیکن فیرر بھی جو تعلیم یونیورسلزم کے بڑے مؤیّد ہیں کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ بعض روحیں تباہ ہو جائیں۔ اب اگر ایک رُوح بھی تباہ ہو گئی۔ تو وہ اصول قائم نہ رہا۔ جس کی بنا پر یونیورسلزم کی تعلیم قبول کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں وہ ہلکے اور کمزور دعوے جو یونیورسلزم کے ماننے والے اکثر پیش کیا کرتے ہیں۔ دراصل گناہ کی بدی کی حقیقت کو پورے طور پر نہیں پہچانتے اور نہ ہی اُن امکانات کو بخوبی محسوس کرتے ہیں جو انسان کی مرضی میں نیکی کے مقابلہ کے لئے موجود ہیں۔ پس ہمیں یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے۔ کہ اِس دنیا میں مسیح کو دیدہ دانستہ رد کرنا ایک

افسوسناک ابدی گم گشتگی میں مبتلا ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں خدا کے مسندِ عدالت سے فتویٰ پاکر جانا گویا اپنے آپکو ہمیشہ کے لئے خدا کے فرزندوں کے جلال اور عزت سے محروم کرنا ہے بعض آیات اوپر اقتباس کی گئی ہیں۔ اور اُسی طرح کی اور آئتیں بھی ہیں۔ جن سے بادی النظر میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا یونیورسلزم کی تعلیم برحق ہے۔ لیکن اُن کی نسبت بھی اُن مفسروں کی جو طرفداری کی لوث سے ملوث نہیں ہیں یہ رائے ہے کہ اُن سے یونیورسلزم کی تعلیم مستنبط نہیں ہوسکتی۔ مثلاً ہم کلام میں پڑھتے ہیں کہ تمام چیزیں بحال کی جائینگی۔ اعمال ۳: ۲۱ (مسیح اس حالت کو "نئی خلقت" یا "نئی پیدایش" کہتا ہے متی ۱۹: ۲۸) مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ جو موعودہ نبی کی نہ سُنیگا وہ نیست و نابود کیا جائیگا۔ اعمال ۳: ۲۳۔ اسی طرح ہم پڑھتے ہیں کہ مسیح سب لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیگا۔ یوحنّا ۱۰: ۳۲ مگر ساتھ ہی ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ جب مسیح آئیگا تو وہ بہت سے لوگوں پر سخت فتویٰ لگائیگا۔ متی ۷: ۲۳ و ۲۵: ۴۱۔ ہم پڑھتے ہیں کہ تمام چیزیں مسیح میں مِلا لی جائینگی۔ اور کہ خداوند مسیح سب چیزوں کو اپنے تابع کرلیگا۔ پر ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مختلف اور بڑے بڑے مفسر متفق ہوکر کہتے ہیں۔ کہ پولوس ہرگز ہرگز اس سے یہ نہیں سکھاتا کہ بدی کی بادشاہت نیکی کی بادشاہت میں تبدیل ہو جائیگی یا بالکل معدوم ہو جائیگی۔ ہمارے خیال میں ان مقامات کا مطلب یہ تو نہیں ہے۔ کہ بدی کی بادشاہت کا بول ہمیشہ بالا رہیگا۔ تاہم ہماری رائے میں یہ ضرور ہوگا کہ بدی کا زور معدوم ہو جائیگا۔ ایک ہی بادشاہی باقی رہیگی۔ خواہ یہ حالت بدی کی حکومت کو تابعدار بناکر وقوع میں لائی جائے۔ خواہ کسی اور طرح سے وقوع میں لائی جائے۔ بہرحال ایسی کوئی طاقت موجود نہ رہیگی جو آئیندہ کو خدا کی بادشاہت کا مقابلہ کرے۔ پر ساتھ ہی اس کے یہ بھی صحیح ہے کہ جن گنہگاروں نے

اس دنیا میں مسیح کو قبول کر کے توبہ نہیں کی اُن کے بچنے کی کوئی صاف دلیل کلام میں موجود نہیں۔

(۲) نہ ہم اُس تعلیم کو قبول کر سکتے ہیں۔ جو یہ سکھلاتی ہے کہ شریر بالکل فنا ہو جائینگے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم قطع نظر اور باتوں کے محض اسی خیال یا تعلیم پر غور کریں اور اس کو اُن رنگوں سے الگ کر دیں جو اسپر وائٹ صاحب نے اپنی کتاب موسومہ "حیات در مسیح" میں چڑھائے ہیں تو ہم کہہ سکیں گے کہ یہ ایک ایسی تعلیم ہے۔ جو قیاساً درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص اس بات کو مانیگا کہ انسان ذاتی اور فطری طور پر غیر فانی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی دائمی ہستی یعنی غیر فانیت کے لئے خدا کی مرضی اور طاقت پر انحصار رکھتا ہے۔ وہ مخلوق ہے لہٰذا اپنی مخلوقیت کی قیود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ پس وہ مخلوق ہو کر ہمیشہ خدا کی قدرت کا محتاج ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کہ گو انسان کو مشیت ایزدی کے مطابق ہمیشہ جیتا اور ہستی میں رہنا تھا۔ مگر اُس کے لئے اس نعمت کو کھو دینا بھی ممکن تھا۔ کیونکہ وہ فی ذاتہ غیر فانی نہیں ہے۔ پھر ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس بات میں بھی بڑا زور ہے کہ کسی مخلوق کو گناہ اور دُکھ کے لئے زندہ رکھنے میں کوئی فائدہ متصوّر نہیں ہو سکتا۔ لیکن بااین ہمہ جب ہم نوشتوں کی طرف اس دعوے کے ثبوت کے لئے متوجہ ہوتے تو شہادت کافی نہیں ملتی۔ دیکھئے کہ

(۱) زور اُن مقامات پر دیا جاتا ہے جو شریروں کی ہلاکت اور بربادی اور اُن کے آگ میں مثل بھوسے اور کڑوے دانوں اور ڈالیوں کے جلنے کا ذکر کرتے ہیں۔ متی ۳: ۱۲ و ۱۳ و ۵۰ و یوحنا ۱۵: ۶۔ آخری قسم کے مقاموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ استعاروں اور تشبیہوں سے پُر ہیں۔ پس جب تک اور شہادت پیش نہ کی جائے تب تک صرف ان مقاموں سے تعلیم زیر بحث کو اخذ کرنا بہت مشکل ہے۔

کیونکہ جس ہلاکت کی بحث درپیش ہے وُہ عدالت کے دِن یعنی خداوند کے دن واقع ہو گی اور ایک رسُول اسے "ناگہان ہلاکت" لکھتا ہے۔ ۱۔ تسلونیقی ۵: ۳۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جو اِس تعلیم کو مانتے ہیں۔ وُہ یہ بھی مانتے ہیں کہ شریر عدالت کے دن ہلاک نہیں ہونگے۔ بلکہ بہُت مُدت تک اپنی بدیوں کے صِلہ میں دُکھ اُٹھائیں گے۔ اور جو سب سے زیادہ گنہگار ہیں وُہ سب سے زیادہ دُکھ اُٹھائیں گے۔

اِس خصوص میں تو یہ دعویٰ عام مانی ہوئی تعلیم سے موافقت رکھتا ہُوا معلُوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اِس کے مُطابق گُنہگار کو اُس کی بدی کی سزا اُسی عرصہ میں مِلتی ہے جبکہ وُہ دُکھ کو محسُوس کرنے کا احساس رکھتا ہے۔ اور فنا جو بعد میں آنیکو ہے وُہ گویا ایک رحیمانہ فعل ہوگا۔ کیونکہ فنا سے گنہگار کے دُکھوں کا خاتمہ ہوگا۔ لہذا فنا اُس کی بدبختی اور وارگونی کا کمال نہیں سمجھا جائے گا۔ پس اگر وھائٹ صاحب کا خیال اعتراض سے بچنا چاہے تو اُسے یہ ماننا چاہیئے۔ کہ فنا موت کے بعد فوراً وقوع میں آجائے گی۔ یا کم ازکم عدلِ الٰہی کے وقت وجود میں آئے گی۔ لیکن اُن کے خیال کے مُطابق "بربادی" عدل کے وقت واقع ہوتی ہے۔ مگر "فنا" بہُت مُدت بعد تک ظہُور میں نہیں آتی۔ پس خود وھائٹ صاحب کے اصُول کے مُطابق ہم محض لفظوں سے فنا کی حقیقت کا اِستدلال نہیں کرسکتے۔

(۲) دُوسری بات اِس تعلیم کے خلاف یہ ہے کہ اس سے سزا کے مدارج معدُوم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ سب کا آخر موت یعنی "فنا" ہے۔ اور اگر اسکے جواب میں یہ کہا جائے۔ کہ نہیں سزا کے مدارج تو قائم رہتے ہیں۔ کیونکہ فنا سے پہلے کسی کا عذاب بہُت دیر تک رہے گا۔ اور کسی کا بہُت تھوڑی دیر تک۔ تو ہم اس کے جواب میں پھر وہی کہتے ہیں جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ سزا تو اپنے عذاب محسُوسہ کو مانا ہے نہ کہ فنا کو جو بعد میں آتی ہے

(۳) لیکن اصل اعتراض جو اس تھیوری پر کیا جاسکتا ہے۔ یا یُوں کہو۔ کہ جو ثبوت کلام سے۔ اس کے بر خلاف پیش کیا جا سکتا ہے۔ وُہ یہ ہے۔ کہ یہ تھیوری یا دعویٰ الفاظ "زندگی" اور "موت" کو استعمال کرتے وقت اُن معانی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جو بائیبل اِن الفاظ سے چسپان کرتی ہے۔ کلام کے مُطابق زندگی سے محض ہستی مُراد نہیں ہے اور نہ موت سے ہستی کا عدم مُراد ہے۔ بلکہ یہ کہ موت سچّی اور کامل زندگی سے الگ ہونیکا نام ہے۔ اب یہ تھیوری خود یہ گواہی دیتی ہے کہ روح نیچرل موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ گویا وُہ وفات کے وقت اُس درمیانی حالت میں داخل ہوتی ہے۔ جو موت اور مرُدوں میں سے جی اُٹھنے کے مابین آتی ہے اور اس حالت میں داخل ہو کر عدالت کے دن کی راہ تکتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ زندگی نوشتوں کے مفہوم کے مُطابق ایک ایسا لفظ ہے جس میں اخلاقی اور رُوحانی معانی بھی داخل ہیں۔ پس ممکن ہے کہ کوئی شخص نوشتوں کے مفہوم کے مُطابق زندگی سے بے بہرہ ہو۔ لیکن پھر بھی جیتا رہے۔ چنانچہ لکھا ہے"جو بیٹے کی نہیں مانتا زندگی کو نہ دیکھے گا۔ بلکہ اُس پر خدا کا غضب رہتا ہے۔ (یُوحنا ۳: ۳۶) اب صاف روشن ہے۔ کہ جس پر خدا کا غضب رہتا ہے۔ وُہ خود بھی ضرُور رہتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ دعویٰ کلام سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ محض ایک قیاس پر مبنی ہے جو عقدے کو حل کرنیکے عوض زیادہ لاینحل بنا دیتا ہے۔

طرفہ یہ ہے کہ وھائٹ صاحب خود اپنی تھیوری سے مُطمئن نہیں ہیں۔ اور اسی لئے وُہ اُسے اُس کی سخت اور تلخ خصوصیتوں سے بری کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ بات کہ جو لوگ اِس دُنیا سے مسیح کا نام سُننے یا اُسکو قبول کیئے بغیر گذرتے ہیں۔ وُہ ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ہیبتناک معلوم ہوتی ہے تو یہ خیال بھی کچھ کم ہولناک نہیں کہ لاکھا لاکھ اشخاص عذاب کے چھوٹے بڑے زمانہ بھگت کر قادرِ مُطلق کے حکم سے

صفحۂ ہستی پر سے بالکل حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔ وھایٹ صاحب اس مشکل کے بوجھ کو محسُوس کرتے ہیں اور اپنے دعوے کو اِس بوجھ سے ہلکا کرنے کے لیے یہ خیال پیش کرتے ہیں۔ کہ ایسے لوگوں کو بُہت دیر تک حادیث میں توبہ کا موقعہ ملے گا۔ چنانچہ وُہ کہتے ہیں کہ اُن غیر قوموں کی مشکل جنہوں نے مسیح کا نام نہیں سُنا۔ اور نیز اُن بے شمار لوگوں کی مُشکل جنہیں مسیح کے قبول کرنے کا کافی موقعہ نہیں ملا۔ اِس بات سے حل ہو جاتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ وھائیٹ صاحب کو یہ امید ہے کہ بنی آدم کا بُہت بڑا حِصّہ اِسطرح نجات کا وارث بن جائیگا۔ اور جو ہلاک ہونگے وُہ بہُت ہی تھوڑے ہونگے صاف ظاہر ہے کہ یہ تھیوری ایک طرف تو ابدی ہلاکت کی تعلیم کی طرف راجع ہے۔ کیونکہ اِس بات کو مانتی ہے کہ جنہوں نے مسیح پر ایمان لاکر نجات نہیں پائی۔ وُہ بہُت دیر تک ایسا عذاب پائیں گے۔ جسے خود محسُوس کریں گے۔ اور دوسری طرف یُونیورسلزم کی جانب جُھکی ہوئی ہے۔ کیونکہ بہُت سے گنہگاروں کو حادیث میں توبہ کرنیکا موقعہ دیتی ہے۔ اب یہ بڑے تعجّب کی بات ہے کہ جس دعوے کا شروع اِس خیال سے ہوتا ہے کہ اِنسان اپنی نیچر میں غیر فانی نہیں ہے۔ اور جس سے آئندہ حالت کی نسبت نیچرل اعتقاد بالکل منقطع ہوجاتا ہے۔ وُہ اِس خیال پر ختم ہو۔ کہ انجیل کے بشارتی اور تبدیل کُن کام کا بُہت سا حِصّہ آئندہ حالت میں واقع ہوگا۔ کیونکہ اِس دعوے کے مُطابق وُہ کام جو وہاں کیا جائیگا۔ بمقابلہ اُس کام کے جو اِس زمین پر ہوتا ہے۔ بُہت ہی بڑا ہوگا۔

(۳) اب ہم تیسری تعلیم کی طرف جو عام مسلمہ تعلیم ہے۔ متوجّہ ہوتے ہیں۔ یہ تعلیم سزا کی ہمیشگی کی قائل ہے۔ اِس کے ماننے والوں کے درمیان بھی ایسے لوگ ہیں جو مسٹر اڈورڈ وھائٹ کی طرح دِقّت کو کم کرنے کے لئے اِس بات کے قائل ہیں۔ کہ توبہ کا موقعہ آئندہ دیا جائے گا۔ اور یہ موقعہ جیسا ہم اُوپر عرض کر آئے ہیں۔ عدالت کے بعد نہیں بلکہ موت اور عدالت کے درمیان آئیگا اِس خیال کے پیرو یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے عالمان علمِ الٰہی کے

CS CamScanner

درمیان پائے جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ خیال بھی اُن مشکلات کا ایک حل ہے۔ جو اِس بات سے پیدا ہوتی ہیں کہ جنہوں نے مسیح کا نام نہیں سُنا یا پُورے پُورے طور پر مسیح کو قبُول کرنیکا موقعہ نہیں پایا۔ وُہ بھی ضرور ہلاک ہونگے۔ اب جو لوگ اِس خیال کو مانتے ہیں وُہ گویا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی شخص مسیح کا نام سُننے اور اُس کی نجات کو قبُول کرنیکا ایک عمدہ موقعہ پائے بغیر ہلاک نہیں ہوگا۔ پس اُن کے خیال کے مُطابق یہ لازمی امر ہے کہ ہر ایک شخص یا تو یہاں یا دُوسری دُنیا میں مسیح کو قبُول کرنے یا رد کرنیکا ایک صاف صاف موقعہ پائے۔ اور اُن کا یہ دعوےٰ اُن مشہُور مقاموں پر مبنی ہے۔ جو پطرس کے پہلے خط میں پائے جاتے ہیں۔ (۱۔ پطرس ۳: ۱۸۔ ۲۰ اور ۴: ۶ کو دیکھو) اور جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا مسیح اُن روحوں کو جو قید میں ہیں۔ اور نیز مُردوں کو انجیل سُنائے گا +

اِس کی نسبت یہ کہنا مناسب معلُوم ہوتا ہے کہ یہ خیال نوشتوں کی گواہی پر اِس قدر قائم نہیں۔ جسقدر کہ عام اصُولوں پر قائم ہے۔ ہماری رائے میں اسے بمنزلہ ایک "ڈاگما" یعنی پکّی تعلیم کے نہیں سمجھنا چاہئے۔ اِس بات کی تائید میں نوشتوں کی تین باتیں غور طلب ہیں +

(الف) پہلی بات یہ ہے کہ کلام کی تمام نصیحتیں اور دِل کو رقت میں لانیوالی باتیں زمانۂ حال کے ساتھ علاقہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ یہ نصیحت کہ "دیکھو اب قبولیّت کا وقت ہے۔ دیکھو یہ نجات کا دن ہے"۔ نوشتوں کا عطر ہے۔ پس ہر ایک تعلیم جو کلام کے اِس اپیل کو کمزور کرتی یا اُس کام کو جو ہمیں اب کرنا چاہیئے۔ آئندہ زمانہ کے لئے رکھ چھوڑنے کی جرأت دلاتی ہے۔ درست نہیں بلکہ خرابی پیدا کرنے والی ہے۔

(ب) پھر ایک یہ امر مُسلّمہ ہے۔ کہ کلام کی تعلیم کے مُطابق انصاف اُن کاموں کی بنا پر ہوگا جو اِس زندگی میں کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے۔ کہ "ہر شخص اپنے کاموں کا بدلہ پائے جو اُس نے بدن کے وسیلے کئے ہوں"۔ ۲ قرنتی ۵: ۱۰

نیز مقابلہ کرو متی ۲۵: ۳۱-۴۶ و مکاشفات ۲۰-۱۲ اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آئندہ حالت موجودہ زندگی کے مقابلہ میں عدالت کی حالت بتائی گئی ہے (عبرانی ۹-۲۷)
اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مقام جس میں آئندہ عدالت کیطرف اشارہ پایا جاتا ہے یہی ظاہر کرتا ہے۔ کہ جو کچھ ہر ایک شخص نے اس دُنیا میں کیا ہے۔ اور جیسی اُس کی حالت اس دُنیا میں رہی ہے۔ اُسی کی بنا پر اُس کی آخری حالت کا فیصلہ ہوگا۔ پس کوئی لفظ یا اشارہ ایسا نہیں پایا جاتا۔ جس سے یہ مترشح ہو کہ وُہ شخص جو بادشاہ کے بائیں جانب پایا جائے گا۔ یا جس پر اُس کے اُن اعمال کے سبب جو اُس نے اس دُنیا میں کیئے ہیں۔ فتویٰ لگایا جائے گا۔ وُہ کبھی دُوسری طرف کے لوگوں میں شامل کیا جائیگا۔ یا مقبولیت سے خوشوقت ہوگا۔ اور اِس لئیے کہ اُس نے اِس حالت میں جو موت اور قیامت کے درمیان آئی تھی توبہ کا موقع پایا۔ اب یہ بات فیوچر پروبے شن (یعنی آئندہ حالت میں معافی کا موقعہ پانے) کی موئید نہیں ہے۔ بلکہ اصولاً کم از کم یہ دلالت کرتی ہے۔ کہ انسان کو اِسی دُنیا میں اپنی عاقبت کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے ✠

(ج) پھر اس کے مقابلہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ کلام آئندہ زمانہ کی توبہ کے متعلق خاموش ہے۔ کیونکہ پطرس کے پہلے خط میں جو دو مقام پائے جاتے ہیں۔ خواہ اُن کی وُہی شرح لی جائے۔ جس سے کہ آئندہ دُنیا میں مُردوں کے درمیان مسیح کے کام کرنے کا اشارہ ملتا ہے۔ لیکن وُہ مقامات ایسی کافی بنیاد نہیں ہیں۔ کہ اُس پر اتنے بڑے دعوے کی عمارت کھڑی کیجائے۔ تو بھی جو اشارے اور خیال اُن مقامات سے پیدا ہوتے ہیں اُنھیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذیل کی باتوں کو بھی یاد رکھنا چاہئے۔ اوّل وُہ مقامات یہ نہیں سکھاتے کہ سب کو آئندہ حالت میں توبہ کا موقعہ ملیگا۔ دوم وُہ یہ نہیں بتاتے کہ مسیح مُردوں کے درمیان کس قسم کی مُنادی کریگا۔ اور سُننے والوں کے ایمان کے متعلق کیا نتیجہ پیدا ہوگا۔ سوم وُہ ہرگز ہرگز یہ ظاہر نہیں کرتے۔ کہ جو خاص باتیں غیر اقوام کے ساتھ علاقہ رکھتی ہیں وُہ اُن کے اُوپر بھی

صادق آتی ہیں۔ جنکو وسیع مواقع دستیاب ہوئے ہیں۔ ہم اُوپر کہہ چکے ہیں کہ عدالت کے متعلق اُن تاثیروں کو بھی دخل ہے جو موروثی تعلقات سے پیدا ہوئی ہیں۔ اب اِس بات کو ہمیں اس خصوص میں بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ کِس قدر ذمہ داری انسان پر ہے۔ اُس کی مرضی بھی اِس معاملے میں کام کرتی ہے۔ ہاں اُس کی شخصی مرضی نیچرل حالات اور موروثی میلانوں کے ساتھ ملکر کام کرتی رہتی ہے۔ پس قطع نظر انجیل کی منادی کے غیر قوموں کو اتنا کافی موقعہ ملتا ہے کہ وہ نیکی کی زندگی کے لیئے فیصلہ کریں اور اِس طرح اُن کی مرضی ایسی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ کہ جس پر ابدی نتائج کا فیصلہ قائم کیا جاسکتا ہے ✢

اب جو بات ہم چاہتے ہیں وُہ یہ ہے کہ جہاں کلام کی روشنی ہمکو کافی نہیں مِلی۔ وہاں ہم کوئی دعوے ایسے طور پر پیش نہ کریں کہ وہ مسلمہ تعلیم معلوم ہو۔ اِسی لیئے ہم اُن بہت سے دعووں سے بھی اتفاق نہیں کرتے۔ جو ابدی ہلاکت کے متعلق پیش کیئے جاتے ہیں۔ ہم فقط اِتنا مانتے ہیں کہ مسیح کو صاف صاف طور پر رد کرنیکا نتیجہ ایسا دُکھ اور نقصان ہوگا۔ جِسکا بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اور کہ کلام میں کوئی اشارہ نہیں مِلتا جس سے یہ ثابت ہو کہ اُس دُکھ اور نقصان کا مداوا مرنے کے بعد ہو سکے گا۔ اِس سے بڑھ کر ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ بات ابدیت کی زندگی کے ساتھ کیا علاقہ رکھے گی۔ اور نہ ہم ایسے قیاسوں میں جو کلام کی صاف روشنی سے دُور لے جاتے ہیں۔ پھنسنا چاہتے ہیں ✢

پس جس نتیجہ پر ہم پہنچنا چاہتے ہیں وُہ یہ ہے کہ چونکہ ہمارے پاس پورا پورا حل پیش کرنے کے سامان نہیں ہیں۔ اِس لیئے ہم کو حل پیش کرنیکی کوشش نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی ایسے نظارے ہیں جو ابھی باقی ہیں۔ اگر کوئی بڑی بڑی امیدیں ایسی ہیں جو آنے والی ہیں۔ اگر مشکلات کی کوئی ایسی تطبیقیں ہیں جو ابھی ظہور پذیر ہونے والی ہیں۔ تو ہمیں خاطرجمع

رہنا چاہیئے۔ کہ وُہ خداوند کے وقت میں آپ ہی ظاہر ہو جائیں گی۔ پس اِس وقت ہمارا یہ کام نہیں کہ ہم پہلے سے پیش بینی کریں۔ اور جس بات پر خدا نے پردہ ڈالا ہے۔ اُسے فاش کر دیں۔ کلام جس بات پر زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ تیاری کا وقت یہاں ہے۔ اور کہ ہماری ذمہ داری اسی دُنیا میں ہے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ مدِّ نظر رکھنی چاہیئے اور اپنی نصیحتوں اور منتوں کو زمانہ حال کی توبہ پر محدُود کر کے اُن امیدوں میں اُلجھنے سے اِعتراض کرنا چاہیئے۔ جن کی تائید پاک کلام نہیں کرتا۔ ہاں ہمیں لوگوں کو یہی سکھانا چاہیئے۔ کہ" اِتنی بڑی نجات سے غافل رہ کر ہم کیونکر بچ سکتے ہیں"۔ (عبرانی ۲: ۳)

اب ہم اِن درسوں کو ختم کرتے ہیں۔ اِن کے نقصوں اور سقموں سے ہم خوب واقف ہیں۔ لیکن خاتمہ میں ہم بڑی سچائی کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ اِس کتاب کے تیار کرنے میں جو مطالعہ ہمیں کرنا پڑا۔ اُس سے یہ اِعتقاد بہت گہرا ہو گیا ہے۔ کہ خدا نے فوق العادت طور پر یعنی کلام اللہ اور مسیح کے وسیلے اپنے آپ کو اپنے بندوں پر ظاہر فرمایا ہے۔ کہ اُس کی محبّت اور فضل کے ارادے مسیح کے ظہور میں مرکوز ہیں۔ اور اُنکا تعلّق تمام عالموں اور ابدیت کے دوروں سے ہے۔ کہ خدا نے ایسی نجات مُہیّا فرمائی ہے۔ جو گنہگار اِنسان کی بہبُودی کے لیئے کافی و وافی ہے۔ کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اُس سے بہرہ ور ہوں۔ اور دُوسروں کو بھی اُس کی برکتوں سے مالا مال کر دیں۔ اِسکے ساتھ ہی ہمارا یہ اِعتقاد بھی گہرا ہو گیا ہے۔ کہ مسیح سے جو طاقت نکلی ہے وُہ نہایت وسیع ہے۔ کہ وُہ صرف اُن لوگوں پر محدُود نہیں جو اُسکے نام کا پُورا پُورا اقرار کرتے ہیں۔ بلکہ اُسکا اثر زمانہ حال کی سُوسائٹی اور دُنیا کے ہر پہلو پر پڑتا ہے چنانچہ دُنیا کی زندگی اور تمام آئیڈیل اُس سے مُوثّر ہیں۔ کہ ایسے حلقوں میں بھی جہاں سچائی ادھوری صُورت میں نظر آتی ہے یا بالکل ہی غائب ہے۔ مسیح کی تعظیم کی جاتی ہے۔ اور یہ مانا جاتا ہے کہ تاریخ میں اُسکا ثانی کوئی نہیں ہے

اور کہ یہ یقین خدا کے بندوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ کہ مسیح کی انجیل پھیلے گی اور آخر کار فتح پائے گی۔ یہ باتیں گہرے مطلب اور بڑی تسلّی سے پڑھیں۔ ہم ان کے لیئے شکر گُذار ہیں۔ ہاں ہم اِن نیک نشانوں کو دیکھکر یعنی یسُوع نام کی وسیع تاثیروں کو دیکھ کر خدا کی تعریف کرتے ہیں۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ گو مخالفت ہو رہی ہے۔ تاہم خدا کی بادشاہت اِس دُنیا میں قائم ہے۔ اور کہ وُہ دِن جب سب چیزیں مسیح میں مِل جائیں گی۔ ابھی آنیوالا ہے۔ ہمارے خیال میں زمانۂ حال کی دُنیا کو مسیحی تعلیم کی ضرورت ہے۔ دُنیا نے اُس کو ترک نہیں کیا۔ دُنیا کے فرقے بہُت سے ہیں اور بہُت لوگ اِنکار بھی بڑے زور و شور سے کرتے ہیں۔ لیکن اِس زمانہ کی کم اعتقادی میں بھی ایک قِسم کی سنجیدگی کا رنگ مِلا ہؤا ہے۔ جو آگے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ کوئی فرقہ باوجود اپنے انکار کے ایسا نہیں جس نے اِس آفتاب سے روشنی نہیں لی۔ سب کا رُخ مسیح کی طرف ہے۔ اور چونکہ وُہ اوپر اُٹھایا گیا ہے۔ اِس لئے اُمید واثق ہے کہ وُہ بہتوں کو اپنی طرف کھینچ لیگا ہم نہیں مانتے۔ کہ مسیحی مذہب کی صداقتیں کُہنہ ہو گئی ہیں۔ لہٰذا اس دین کی صداقتوں کا سُورج انسانی خیالات کے مغرب میں غروُب ہو جائیگا۔ نہیں۔ ہماری رائے میں اُس کی ایک کرن بھی ایسی نہیں جس کے بغیر ہم گذارہ کر سکیں۔ دُنیا اُسکی تمام شعاعوں کی محتاج ہے اور وقت آئیگا۔ جب وُہ اسکا اعتراف کریگی پس جب ہم ایمان اور بے ایمانی میں جنگ ہوتی دیکھتے ہیں تو ہم مایُوس نہیں ہوتے۔ بلکہ ہمیں یقین ہے کہ ایمان فتح پائیگا۔ جس طرح نوح کی کشتی پانی پر تیرتی رہی۔ اسی طرح ہمیں اُمید ہے کہ مسیح کا مذہب بے ایمانی اور الحاد کے طُوفان پر تیرتا رہے گا۔ جیسا کہ گذشتہ زمانوں میں تیرتا رہا ہے۔ اور اُس میں اِنسانیت کے آئندہ کی اُمیدیں مرکوز رہیں گی۔

خداوند اس کتاب پر اپنی برکت بخشے اور اس کے وسیلے سے اپنا جلال ظاہر کرے۔ آمین +

فہرست کتب

حل مشکلات - یعنے خدا اور دنیا کی نسبت مسیحی مذہب کی رائے حصہ اوّل قیمت ۶ر

مسیحی دین اور اخلاق - جس میں مسیحی تعلیم کی اخلاقی اور روحانی حقیقت الٰہی شخصیت کفارہ کی تعلیم - پاکیزہ بننے کا طریقہ - جن اصول پر مسیحی تعلیم مبنی ہے - ان کی تشریح مشخص خدا کے بارے میں مشخص خدا کی شہادت - ضمیر کی شہادت اخلاقی خدا کے بارے میں - مسئلہ ثالوث اخلاقی مکاشفہ ہے - اور نیز دیگر باتوں پر مفصّل بحث کی گئی ہے - قیمت ۸ر

طیطس یعنی رفیق صلیب - خداوند یسُوع مسیح کے حالات قصّے کے پیرائے میں - قیمت ۶ر

تاریخ بائیبل - مع حالات دیگر اقوام - جن کا بائیبل میں ذکر ہے ضخیم کتاب ہے - قیمت (۱۲ ر)

حیات المسیح - مسیح کی زندگی کے مفصل حالات مع مفید مطالب - قیمت ۱۲

مسیح کا نمونہ - ڈاکٹر سٹاکر صاحب کی مشہور کتاب - جس میں ہر امر پر خداوند مسیح کی زندگی کی پیروی کے سبق درج ہیں - قیمت ۸ر

مسیح کی پیروی - ٹامس اے کمپس کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ قیمت ۸ر

حقیقت المسیح - مصنفہ پادری - پی - کارنیگی - سمپسن صاحب ایم - اے و مترجمہ پادری طالب الدین صاحب بی اے - قیمت ۸ر

مکتب مسیح میں دُعا کی تعلیم - دُعا کے متعلق ہدایات - از مرے صاحب قیمت ۶ر

یاد محبوب - صبح شام کے لئے میکڈف صاحب کی مشہور کتاب - قیمت ۴ر

حیات داؤد - از پادری ایف - بی - مائیر صاحب - نہائیت دلچسپ رُوحانی کتاب ہے - جس میں حضرت داؤد کی زندگی سے مسیحی زندگی کی رہنمائی و ترقی کے لئے دلچسپ سبق نکالے ہیں - قیمت ۱۲

ہم کسطرح لوگوں کو مسیح کے پاس لائیں - مترجم از ڈاکٹر ٹوری - قیمت

مسیح کے خاص دوست۔ از پادری جے آر بُکر صاحب۔ نہائیت اعلےٰ درجہ کی روحانی کتاب ہے۔ جس میں مقربین حواریوں اور دیگر عورتوں کی زندگی کا حال دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ قیمت ٦ر +

مسیحی کا سفر۔ جان بنین صاحب کی مشہور عالم کتاب یعنی خواب کے پیرائے میں روحانی سفر کا قِصّہ۔ حِصّہ اوّل ٦ر سے ١٢ر تک۔ حِصّہ اوّل و دوم ١٢ر سے ۸؍ تک +

طریق دُعا۔ میڈم گیون صاحبہ ایک مشہور فرنچ لیڈی کی کتاب سے ترجمہ ہوئی۔ روحانی زندگی کے لئے نہائیت مفید ہے۔ قیمت ۴ر +

مقدس آگستینوس کے اقرارات۔ قدیم زمانے کی نہایت مشہور روحانی کتاب ١٢ر

زندہ مسیح اور اناجیل اربعہ۔ مسیحی تجربہ اور اناجیل کی صحت کے تاریخی ثبوت قیمت ١٢ر

یسوُع مسیح کی گرفتاری اور موت۔ تاریخی اور روحانی طور پر بحث کی ہے قیمت ١٢ر

ذہین شبیر۔ یہ کتاب زمانہ سابق کے مسیحیوں کے قابل تقلید استقلال کا پورا فوٹو ہے قیمت

عیسیٰ کی سیرت۔ عادات و خصائل پر مفصّل بحث کی ہے۔ قیمت ١٠ر +

عہد جدید۔ نئے عہد نامے کی کتابوں کا بیان۔ جس کو پادری ایچ۔ جی گرے اور پادری علی بخش نے تیار کیا۔ نئے عہد نامہ کے مطالعہ کے لئے ایسی کتاب نہائیت مفید ہے۔ ١٦٠ صفحے (۸ر) +

حیاتِ پولوس۔ سٹاکر صاحب کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جو پادری علی بخش صاحب نے کیا۔ انگریزی میں یہ بہت مشہور کتاب ہے اور اُردو میں بھی کم مفید ثابت نہ ہوگی۔ ١١٢ صفحے۔ قیمت (۴ر)

خدا کی ہستی۔ مترجمہ پادری طالب دین صاحب انگلستان اور امریکہ کے مشہور علماء کی تصنیفات سے تالیف کی گئی ہے۔ ١٥٢ صفحے قیمت (۸ر) +

رُوحانی طاقت کے متعلق چند سنجیدہ خیالات۔ مترجم از ایس۔ ڈی جلال ظ صاحب۔ ١٦٨ صفحے۔ قیمت ۴ر +

نام مینجر صاحب رلیجس بُک سوسائیٹی انارکلی لاہور آنی چاہئیں